میکسم گورکی

منزل کی تلاش

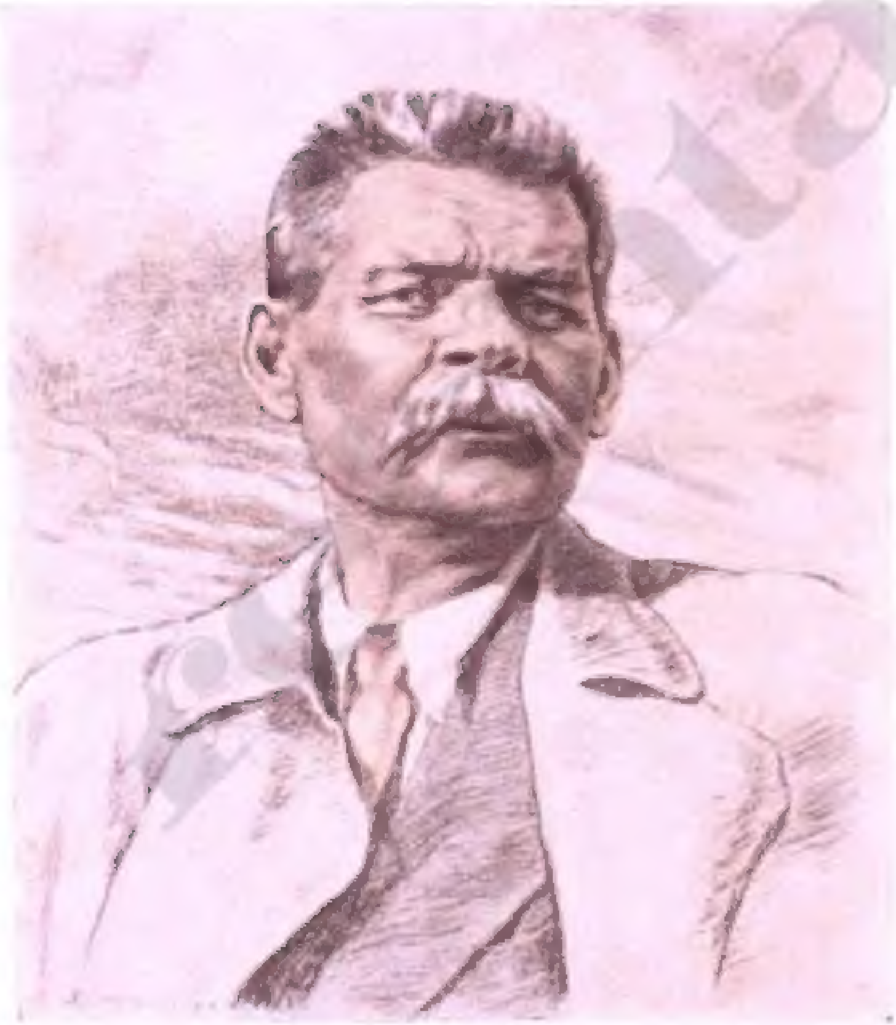

М. Горький

میکسیم گورکی

منزل کی تلاش

(میری یونیورسٹیاں)

بدیسی زبانوں کا اشاعت گھر
ماسکو

rekhta

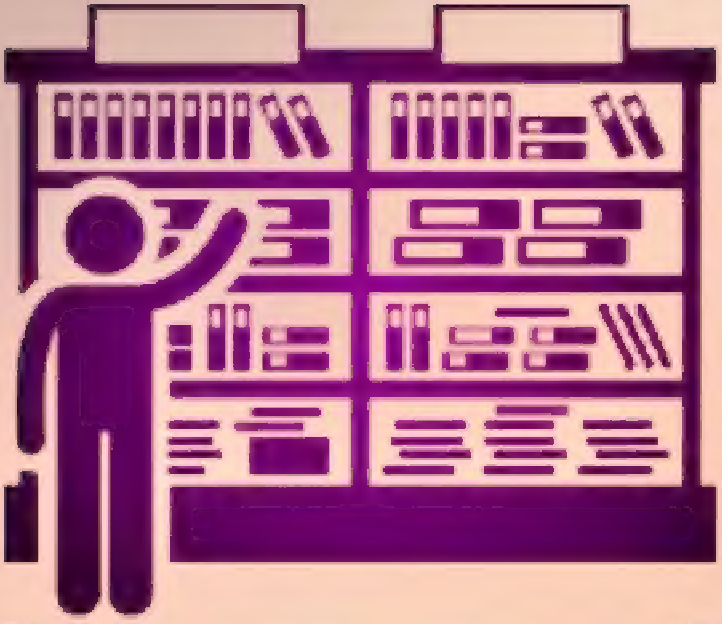

My LIBRARY

Rare Books' Collection

Pdf Made By: Muhammad Asif

Group Name: My Library

Id Contact: M.Asif.007

ترجمہ: رضیہ سجاد ظہیر
ایڈیٹر: انور عظیم

rekhta

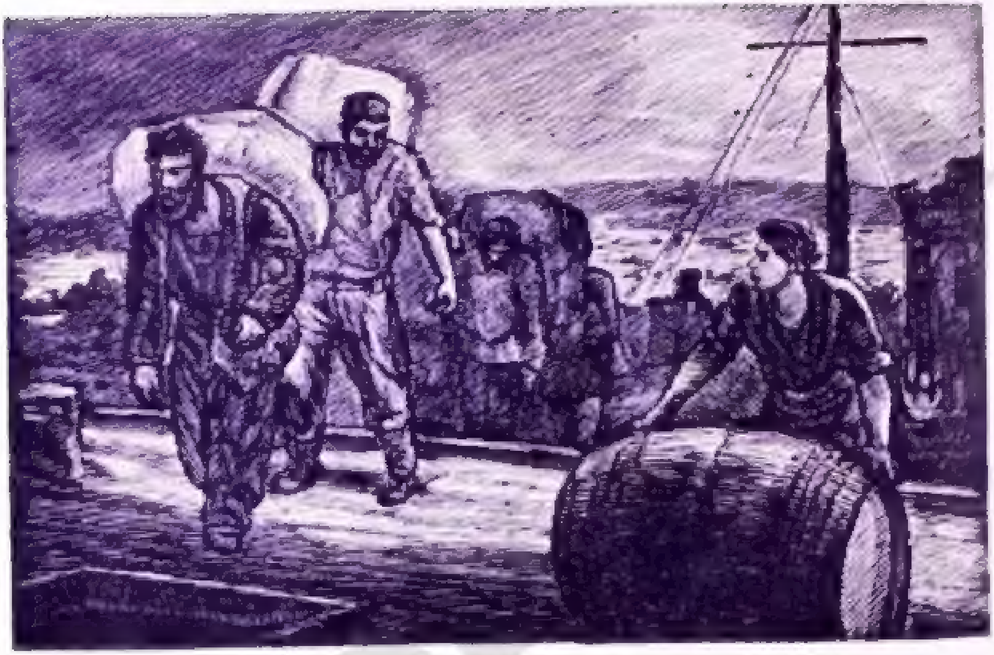

اچھا تو میں قازان سدھار رہا تھا، یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ــــ جی! اور کیا!

یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا خیال ایک ھائی اسکول کے طالب علم **ایوربنوف** نے میرے دماغ میں گھسایا تھا — وہ اچھا نوجوان تھا ــــ بڑا خوبصورت، عورتوں کی سی نرم آنکھیں — ہم دونوں ایک مکان میں لیکن الگ الگ کمروں میں رہتے تھے — اکثر وہ مجھے کتابیں ھاتھہ میں لئے، آتے جاتے دیکھتا — اس کے دل میں مجھہ سے جان پہچان بڑھانے کی خواھش ھوئی — اور جلد ھی اس نے مجھہ پر یہ جمانا شروع کیا کہ میں "علم حاصل کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ھوں —"

"قدرت نے تم کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ سائنس کو آگے بڑھاؤ" اس نے اپنے بالوں کو بڑی خوبصورتی سے پیچھے کی طرف جھٹکا دیتے ھوئے کہا —

مجھے اس وقت یہ بھی معلوم نہ تھا کہ انسان بحیثیت خرگوش بھی سائنس کو آگے بڑھا سکتا ہے اور ایورینوف نے مجھ پر بالکل واضح کردیا کہ یونیورسٹی میں میرے ہی ایسے لڑکوں کی ضرورت ہے۔ لومونوسوف کی یاد ایک روشن مثال کی طرح بیان کی گئی۔ ایورینوف نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ قازان میں میں اس کے ساتھ رہوں اور خزاں اور سردی کے موسم میں خوب محنت کرکے ہائی اسکول کی پڑھائی ختم کرلوں، ’’چند امتحانات،، پاس کروں، یونیورسٹی مجھ کو وظیفہ دے دے گی اور پھر پانچ سال کے اندر میں عالم ہوکر وہاں سے نکل آؤں گا۔ یہ سب دیکھنے میں تو نہائت آسان لگتا تھا کیونکہ ایورینوف کی عمر انیس سال تھی اور اس کا دل نیکی اور محبت سے لبریز تھا۔

اس نے اپنے امتحانات پاس کئے اور چلا گیا۔ تقریباً دو ہفتے بعد میں بھی اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔

روانگی کے وقت نانی اماں نے کہا:

’’دیکھ ـــ لوگوں پر غصہ نہ کرنا۔ تو ہر وقت جھلایا رہتا ہے۔ بڑا سخت دل ہوتا جا رہا ہے تو۔ اکڑفوں دکھانے لگا ہے تو۔ یہ بات تجھ میں تیرے نانا سے آئی ہے۔ مگر دیکھ اب تیرے نانا کا کیا حشر ہے! اتنی عمر ہونے کو آئی، جوانی تو حماقتوں میں کٹ گئی اور اب جو بڑھاپا آیا تو بالکل کڑوا نیم! ایک بات یاد رکھنا بیٹا کہ خدا نہیں انسانوں پر فیصلے دیا کرتا ـــ یہ تو شیطان کی تفریح ہے۔ اچھا خدا حافظ...،، اور انہوں نے اپنے تھل تھل کرتے، دھوپ سے جلے، تپے ہوئے چہرے پر سے دو آنسو پونچھے ـ’’اب ہماری ملاقات کبھی نہ ہوگی۔ تو نے ایک بے چین روح پائی ہے، بیٹا۔ اس لئے تو دور، بہت دور چلا جائے گا اور میرے اب مرنے کے دن نزدیک ہیں ـ،،

ادھر ایک عرصے سے میں اپنی محبوب اور پیاری نانی سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا، ان سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی لیکن

اس وقت ایک دم سے مجھے اس حقیقت کا احساس ہوا کہ اب زندگی میں کوئی ایسا دوست نصیب نہ ہوگا جو اس قدر میرے وجود سے قریب ہو کہ گویا میری ہی ہستی کا ایک حصہ ہو۔

میں نے کشتی کے پچھلے حصے پر کھڑے ہوکر دیکھا تو وہ چھوٹی سی بندرگہ پر کھڑی اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا رہی تھیں اور گھسی ہوئی پرانی شال سے اپنا چہرہ اور سیاہ آنکھیں پونچھتی جا رہی تھیں ـــ آنکھیں جو بنی‌نوع انسان کی محبت کی ان چنگاریوں سے جھلملا رہی تھیں جو کبھی بجھ نہیں سکتیں۔

پھر میں اس شہر میں پہونچ گیا جو نیم تاتاری تھا۔ ایک نیچی سی پہاڑی پر، غربت‌زدہ گلی میں ایک مکان تھا جس کے چھوٹے چھوٹے تاریک کمرے ایک دوسرے سے سٹے ہوئے تھے۔ مکان کے ایک طرف کو ایک بڑا سا میدان تھا جس میں جنگلی گھاس خوب گھنی اگی ہوئی تھی اور اس کے بیچوں بیچ اینٹوں کی ایک پرانی عمارت تھی۔ عمارت کے چاروں طرف بھی گھاس تھی اور ذرا اور آگے بڑی بڑی جھاڑیوں کا گھیرا تھا جو حدبندی کا کام دیتا تھا۔ اس عمارت کے کھنڈر کے نیچے ایک تہ‌خانہ تھا جس میں ادھر ادھر کے آوارہ لینڈی کتے جیتے مرتے رہتے۔ مجھے یہ تہ‌خانہ بہت اچھی طرح یاد ہے ـــ یہ میری یونیورسٹیوں میں سے ایک تھا!

ایورینوف کا خاندان (ایک ماں اور دو بیٹے) پنشن پر بسر کرتا تھا جو نہائت ہی مختصر تھی۔ جب میں ان کے گھر پہونچا تو پہلے ہی چند دنوں میں روزانہ یہ حسرت‌ناک منظر دیکھا: وہ بے جان، مختصر سی بیوہ عورت جب بازار سے واپس آتی تو اپنا خریدا ہوا سامان باورچی‌خانے کی میز پر پھیلاتی اور اس کے سامنے روز ہی یہ مشکل مسئلہ درپیش ہوتا کہ خراب قسم کے گوشت کے ٹکڑوں کو کس طرح پکائے جو تین تندرست لڑکوں کے لئے اچھی اور کافی غذا بن سکے، پھر اسے بھی تو اپنا پیٹ بھرنا پڑتا تھا۔

rekhta

وہ بہت کم بات کرتی تھی اور اس کی بھوری آنکھیں کچھ اس طرح بے آس اور مایوس ہو کر اندر کو بیٹھ گئی تھیں جیسے کوئی لدو بیل اپنی تمام طاقت ختم کرکے ڈھلائی سے ایک جگہ ڈھے پڑے! بیچارہ بیل اپنے بوجھ کو منزل تک پہونچانے کی کوشش تو کرتا ہے لیکن اسے معلوم ہے کہ منزل کبھی نہیں آئیگی —— پھر بھی وہ بوجھ کو کھینچے ہی لئے جاتا ہے!

مجھے آئے کوئی تین چار دن گذرے ہوں گے کہ ایک دن میں اس کو کچھ سبزی بنانے میں مدد دے رہا تھا۔ لڑکے دونوں ابھی سو رہے تھے۔ اس نے تھکے ہوئے لہجے میں آہستہ سے مجھ سے پوچھا "تم شہر کیوں آئے ہو؟"

"پڑھنے، یونیورسٹی میں پڑھنے۔"

اس کی بھویں آہستہ آہستہ اٹھنے لگیں، خشک ماتھے کی لکیریں پھیلنے لگیں، چھری ہاتھ سے اچھل پڑی اور انگلی کٹ گئی۔ زخم کو چوستے ہوئے وہ ایک کرسی پر ڈھے پڑی لیکن پھر ایکدم اچھل پڑی اور زور سے بولی:

"آہ کمبخت، بدبخت... شیطان..." پھر انگلی کو رومال سے باندھ کر میری تعریف کرتے ہوئے کہنے لگی "تم آلو اچھی طرح چھیل لیتے ہو۔"

میرا بھی خیال تھا کہ ضرور چھیل لیتا ہوں چنانچہ میں نے اسے بتایا کہ اسٹیمر پر میں نے باورچی خانے میں کام کیا تھا۔

اس نے پوچھا "تو تمہارے خیال میں اتنی لیاقت یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لئے کافی ہے؟"

اس زمانے میں مجھ میں شئے لطیف کی ذرا کمی تھی، مذاق جلدی پلے نہیں پڑتا تھا۔ میں سمجھا کہ سنجیدگی سے سوال کر رہی ہے اور اس کو پورا سلسلہ بتانے لگا کہ کیا کیا جائیگا جس کے نتیجے کے طور پر علم کے مندر کا دروازہ میرے لئے کھل جائے گا۔

rekhta

اس نے ٹھنڈی سانس بھری ’’نکولائی... آہ نکولائی، بس کیا کہوں...‘‘

عین اسی وقت نکولائی اٹھہ کر منہہ دھونے باورچی خانے میں آیا– نیند ابھی تک اس کی آنکھوں میں بھری تھی، بال الجھے ہوئے تھے لیکن وہ حسب دستور بہت اچھے موڈ میں تھا– کہنے لگا ’’کیوں امی، سموسے بنیں تو مزہ آ جائے–‘‘

’’ہاں بن جائیں گے،‘‘ ماں نے اتفاق کرتے ہوئے جواب دیا–

شامت اعمال کہ میں نے کھانا پکانے میں اپنی معلومات ظاہر کرنے کے لئے کہہ دیا کہ یہ قیمہ سموسوں کے لئے ٹھیک نہیں ہے اور پھر کافی بھی نہیں ہے–

اس بات پر وروارا ایوانوونا بڑی بگڑی اور مجھہ پر کچھہ ایسے فقرے کسے کہ میرے کان لال ہوکر پھیلتے ہوئے محسوس ہونے لگے– وہ جو گاجروں کی گٹھی دھو رہی تھی، وہ اس نے پھینک دی اور باورچی خانے سے باہر نکل گئی– نکولائی نے مجھے آنکھہ ماری ’’اماں پر موڈ طاری ہے–‘‘

وہ اطمینان سے ایک بنچ پر بیٹھہ گیا اور میری معلومات بڑھانے لگا کہ اگر مجھے ٹھیک یاد پڑتا ہے تو سوئٹزرلینڈ کے کسی سائنس داں نے ثابت کیا تھا کہ عورتیں عام طور پر مردوں سے زیادہ جذباتی ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کی تھیوری کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا– ایک انگریز عالم نے بھی اسی موضوع پر کچھہ اسی طرح کی بات کہی تھی– اس کا نام جان اسٹوارٹ مل تھا–

نکولائی کو مجھے سبق دینے میں بڑا لطف آتا تھا اور جہاں بھی موقع ہاتھہ آتا وہ میرے دماغ میں کوئی نہ کوئی ضروری شے ڈھونڈ کر ٹھونس دیتا– گویا اس شے کی لاعلمی سے میری زندگی ناممکن ہوجاتی! میں اس کے الفاظ سے بڑے مزے میں سیراب ہوتا اور کچھہ دیر بعد فوکو، دے لاروش فوکو اور دے لا روش ژاکلین آپس میں گڈمڈ

rekhta

ہو کر میرے ذہن میں ایک ہی ہستی کی صورت اختیار کرتے اور میں یہ نہ سمجھ پاتا کہ کلووازے نے دوموریے کا سر کٹوایا تھا یا دوموریے نے کلووازے کا! یہ مہربان نوجوان اس بات پر اتارو تھا کہ مجھے کچھ، بنا کر چھوڑے گا — وہ باربار مجھے اس کا یقین دلاتا لیکن میری باقاعدہ تربیت کے لئے نہ تو ماحول تھا، نہ وقت تھا — وہ جوانی کی رجائیت اور بے نیازی کے ساتھ اندھادھند پلان بناتا اور یہ اس کو نظر نہ آتا کہ اس کی ماں ہم لوگوں کو زندہ رکھنے کے لئے کس قدر محنت مشقت کر رہی ہے! کس قدر جوڑ توڑ اس کو کرنا پڑتا ہے! اس کا چھوٹا بھائی تو اور بھی اس حقیقت سے بے نیاز تھا — وہ ایک خاموش سا لڑکا تھا، اس کی تمام حرکات سکنات میں سستی ہوتی تھی — وہ اسکول میں پڑھتا تھا — لیکن میں باورچی خانے کی کیمیا اور اقتصادیات کا مطالعہ زندگی میں بہت نزدیک سے کر چکا تھا — مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس عورت کو اپنے بچوں کی بھوک اور ان کے پیٹ کو دھوکا دینے کی جان توڑ کوشش تو پہلے ہی سے روزانہ کرنی ہوتی تھی، اب ایک اور اجنبی اور غیر نوجوان کا بھی پیٹ بھرنا ہوگا —— اور نوجوان بھی ایسا جو دیکھنے میں بد صورت ہے اور جس کے طور طریقے گنوارو اور بھدے ہیں — چنانچہ ظاہر ہے کہ اس گھر میں روٹی کا ایک ایک ٹکڑا جو میں کھاتا تھا، وہ میرے ضمیر پر بوجھ کی طرح محسوس ہوتا تھا — میں نے روزگار کی تلاش شروع کی! صبح تڑکے گھر سے نکل جاتا اور اتنی دیر باہر رہتا کہ یقین ہو جاتا کہ کھانا کھالیا ہوگا — موسم خراب ہوتا تو اس کھنڈر کے تہ خانے میں جا پڑتا اور وہیں اپنا وقت گذارتا — مردہ کتوں اور بلیوں کے بیچ میں بیٹھا سڑاند کی بو سونگھتا ہوا میں باہر موسلادھار بارش کی آواز اور اس کے ساتھ ہواؤں کی چیخ پکار، آہ و بکا سنتا رہتا — بہت جلد مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا خواب ایک جھوٹا اور کھوکھلا خواب تھا اور اس سے تو کہیں بہتر

یہ ہوتا کہ میں ایران بھاگ گیا ہوتا — چنانچہ میں اپنے آپ کو ایک جادوگر تصور کرتا جو سیبوں کے برابر برابر دانوں سے گیہوں اور جو کے پودے اگاتا، پنسیری کا ایک ایک آلو اور اس دنیا کے لئے اور جو بہت سے فائدے کے کام کرتا اس کا تو خیر کوئی ذکر ہی نہیں — بے شمار نیک کام، اس دنیا کے فائدے کے لئے جہاں زندگی صرف میرے لئے ہی نہیں، ہر ایک کے لئے دوبھر تھی —

میں ابھی سے عجیب و غریب سیاحتوں اور بہادرانہ کارناموں کے خواب دیکھا کرتا۔ یہ خواب میری زندگی کے مشکل دنوں کو آسان تر کر دیتے تھے اور چونکہ ان مشکل دنوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ ہوتی تھی اس لئے میں اس طرح کے خواب دیکھنے کا عادی اور خوب ماہر ہو گیا تھا — میں نہ تو اپنے سوا کسی کی مدد کا امیدوار تھا، نہ قسمت کی اعانت پر بھروسہ کرتا تھا — لیکن رفتہ رفتہ میری طبیعت میں ایک سی قوتِ ارادی پیدا ہوتی جا رہی تھی جو بہت مضبوط تھی — زندگی جتنی ہی مشکلیں میرے سامنے لا کر ڈالتی مجھے اتنا ہی یہ محسوس ہوتا کہ میں پہلے سے زیادہ مضبوط اور عقلمند ہو گیا ہوں — بہت چھوٹی سی عمر سے یہ حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی تھی کہ انسان اپنے حالات سے جو جد و جہد کرتا ہے، ان سے جو جنگ کرتا ہے وہ وہی انسان کو مکمل بناتی چلی جاتی ہیں!

بھوک اور مرنے سے بچنے کے لئے میں والگا کے کنارے والی گودیوں میں جایا کرتا تھا — وہاں آسانی سے پندرہ یا بیس کوپک کی مزدوری مل جایا کرتی تھی۔ یہاں قلیوں، اٹھائی گیروں اور چوٹٹوں کے درمیان مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں لوہے کی ایک سیخ ہوں جسے انگاروں پر تپایا جا رہا ہے، کیونکہ روز طرح طرح کے شدید اور ایسے تاثرات ذہن پر جمتے تھے جو ذہن کو جھلسا کر رکھ دیتے تھے — یہ ایک ایسی چکر کھاتی ہوئی دنیا تھی جس میں انسان کے احساسات کی سطح کھردری اور ناہموار تھی، اس کی حرص و ہوس ننگی اور

بےحساب نظر آتی تھی — زندگی کے بارے میں ان لوگوں کا جو تلخ رویہ تھا وہ مجھے اپنی طرف کھینچتا تھا، دنیا کی ہر چیز کا وہ جس طرح مذاق اڑاتے تھے اور جس طرح تمسخرانہ ذہنیت رکھتے تھے وہ میرے لئے دلچسپ تھا اور یہ بات بھی میرے لئے دلچسپ تھی کہ خود اپنی طرف سے وہ بےپرواہ اور بےتاثر تھے۔۔ میں نے زندگی میں جو کچھ سیکھا ہے وہ مجھے ان سے قریب کرتا تھا اور دل میں یہ امنگ اٹھتا تھا کہ میں بھی اس طعن و تشنیع بھری زندگی کے سمندر میں غوطہ لگا جاؤں۔۔ [illegible] شہرت کے لکھے ہوئے قصے اور بہت سی بےشمار ناولیں جو میں نے اس دوران میں پڑھی تھیں، وہ بھی اس دنیا میں میری دلچسپی کو بڑھاتی تھیں —

مثلاً باشکن تھا۔۔ پیشہ ور چور — جو پہلے استادوں کے داغ کا طالب علم تھا، سب ہی کا مرشد، جس کو اکثر لوگ سنتے رہتے تھے — اس نے نہایت سادگی کے ساتھ مجھ کو سبق سکھایا:

''تم اتنا جھجکتے کیوں ہو؟ جیسے کوئی البیلی شرمیلی لڑکی — کہ آبرو لٹ جانے کا ڈر ہے؟ لڑکیوں کے لئے تو بیشک آبرو ہی سب کچھ ہے مگر تمہارے لئے تو آبرو ایک بوجھ ہی ہے — میں ایمان دار ہوں ہے مگر پیٹ بھرنے کے لئے گھاس ہو اس کو بھی کھانی ہی پڑتی ہے —''

باشکن کا قد چھوٹا تھا، بال سرخ، داڑھی شیو کرتا تھا ایکٹروں کی طرح — اس کے تیور، دبے دبے حرکات و سکنات کو دیکھ کر بلی کا خیال آتا تھا — میری طرف اس کا برتاؤ مشفق استاد کا سا تھا، اور یہ بھی مجھے نظر آتا تھا کہ وہ خلوص دل سے خواہش مند تھا کہ میری تقدیر بن جائے اور مجھے خوشی نصیب ہو — وہ بےحد ذہین تھا اور بہت سی کتابیں پڑھ چکا تھا، جن میں ''کونٹ آف مانٹی کرسٹو'' اس کو سب سے زیادہ پسند تھی —

''اس کتاب میں دل ہے دل، اور پھر ساتھ ہی کسی مقصد سے بھی لکھی گئی ہے —''

اسے عورتوں سے بےحد دلچسپی تھی اور ان کا ذکر کرتے وقت آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ مزے لے لے کر ہونٹ چاٹتا جیسے اس کے بورے لیلے ہوئے جسم پر کوئی دورہ کر رہا ہے۔ اس دورے میں کوئی بات ایسی غیر صحت‌مند تھی جو مجھے محسوس بھی ہوتی تھی اور میں اس بات سے نفرت بھی کرتا تھا — پھر بھی اس کی باتوں کی خوبصورتی کے خیال سے بڑے شوق سے میں اس کی گفتگو سنتا رہتا — اس کے پھیکے گالوں پر سرخی آجاتی، سیاہ آنکھیں وفور شوق سے چمکنے لگتیں، دبی زبان کہتا ''عورت! عورت! آہ، میں عورت کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں — جیسے شیطان گناہ سے بالاتر ہے اسی طرح عورت بھی ہے! محبت کی زندگی! آہ، اس سے بہتر کوئی چیز اب تک تو ایجاد ہی نہیں ہوئی!''

اس کو بیان پر بڑی قدرت حاصل تھی اور وہ چٹکلوں میں رنڈیوں کے لئے گیت بنا لیا کرتا تھا جن میں ناکام عشق کا غم بھرا ہوتا تھا — یہ گیت والگا کے آس پاس تمام شہروں میں گائے جاتے تھے — جہاں اس نے اور بہت سے شعر کہے تھے وہاں اس گانے کے بول سب سے زیادہ مشہور تھے:

دوشیزہ میں بدصورت، غریب،
جسم پر میرے چیتھڑے پڑے ہوئے ہیں،
کون پکڑے میرا ہاتھ، کون بنائے مجھے دل کی رانی،
ہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں، کوئی نہیں!

تروسوف بھی میرا مربی اور ہمدرد تھا — ویسے تو وہ چال چلن کا اچھا نہ تھا لیکن صورت‌شکل کا اچھا تھا —— بھڑکیلے کپڑے پہنتا، موسیقاروں کی سی نازک نازک انگلیاں تھیں — وہ اس محلے میں دوکان کیا کرتا تھا جہاں جہازران آکر ٹھہرتے تھے — دوکان کے بورڈ پر

تو لکھا تھا ''گھڑیوں کی مرمت،، لیکن دراصل تروسوف چوری کا مال بیچا کرتا تھا۔

اپنی کھچڑی داڑھی پر شان سے ہاتھ پھیرتا، بے باک اور چالاک آنکھیں میچ کر مجھ سے مخاطب ہوتا ''مکسم! دیکھنا تم کبھی ان چونٹوں کے جھانسے میں نہ آجانا۔ تم روحانی قسم کے آدمی ہو۔،،

''روحانی قسم سے کیا مطلب؟،،

''کیوں؟ ارے! یعنی وہ لوگ جو دوسروں سے حسد نہیں کرتے، صرف معلومات اور علم کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔،،

میرے متعلق یہ بیان صحیح نہ تھا۔ میں اکثر لوگوں پر رشک کیا کرتا تھا۔ مثلاً دشکین کی خوش‌بیانی پر مجھے رشک آتا تھا۔ اس کی عجیب وغریب شاعرانہ طرز گفتگو، غیر معمولی صنائع وبدائع کا استعمال اور بات کا داؤپیچ! اس نے اپنی محبت کی ایک داستان سنائی تھی جو مجھے اب تک یاد ہے:

''ایک دن رات کو جب خوب بادل چھائے ہوئے تھے، میں ایک بورڈنگ ہاؤس میں، ایک درخت کے کھوکھلے میں الو کی طرح گٹھری بنا پڑا تھا۔ یہ بورڈنگ ہاؤس اسوی یاژسک کے قصبے میں تھا اور یہ شہر نہایت ہی پھٹیچر تھا۔ بہت ہی افلاس‌زدہ! اس وقت خزاں کا موسم تھا۔۔ اکتوبر کا مہینہ۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور ہوا یوں سانس لے رہی تھی جیسے کسی دل جلے تاتاری کے گلے سے پھوٹ رہی ہو ۔۔۔ ایک مسلسل ہوووو...

''اور لو وہ آپہونچی، ایسی نازک نازک، گلابی رنگ جیسے سورج نکلتے وقت بادل ہوں اور اس کی آنکھوں میں روح کی پرفریب پاکیزگی۔ کہنے لگی، میرے محبوب میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے،،۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے لیکن پھر بھی میں نے اس کی بات کا یقین کیا۔ میری عقل کو اچھی طرح سب کچھ معلوم تھا لیکن دل نہیں مانتا تھا کہ وہ جھوٹ بولتی ہوگی۔،،

بات کرتے وقت وہ بھی آنکھوں کو آدھا بند رکھتا، پورا جسم جھومنے لگتا، ہاتھ بڑے ناز سے اٹھتے اور گرتے تھے، کبھی سینے پر پہونچ جاتے کبھی دل پر — اس کی آواز دھیمی اور بے جان تھی لیکن الفاظ اس کے خوب صاف ہوتے تھے جیسے بلبل کے نغمے ان الفاظ میں سمو دئے گئے ہوں!

مجھے تروسوف پر بھی رشک آتا تھا — یہ شخص سائبیریا، خیوا، بخارا وغیرہ کے متعلق بڑی حیرانکن داستانیں سنایا کرتا تھا۔ وہ بڑے تمسخر اور طنز کے ساتھ بڑے پادریوں کی زندگی کے متعلق بات کرتا، اور ایک دن چپکے سے زار الیکسانڈر سوئم کے متعلق کہنے لگا:

''یہ زار ہے منصب کا استاد ہے بڑا...''

میرے نزدیک تروسوف ناول کے ان مصنفوں کی طرح تھا جو ناول کے ختم ہوتے ہوتے بڑی پر اسرار شخصیتوں اور ہستیوں کو اس طرح چھوڑ دیتے ہیں کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے —

کبھی کبھی جب راتوں کو امس ہوتی تو یہ لوگ وولگا ندی کے اس پار چلے جاتے، وہاں جھاڑیوں میں بیٹھ کر کھاتے اور پیتے اور بیچ میں اپنے معاملات کے متعلق بات چیت کرتے — زیادہ تر تو زندگی کے الجھاوے اور انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں پر بحث ہوتی لیکن سب سے زیادہ عورت کے موضوع پر گفتگو ہوتی اور اس گفتگو کا رخ یا تو کمینہ پن کا رنگ لئے ہوتا یا مایوسی کا — کبھی کبھی ان کی باتوں میں بڑا درد اور جذبہ ہوتا اور زیادہ تر یہ باتیں کچھ ایسے جذبات کے ساتھ کہی جاتیں جیسے وہ لوگ گھپ اندھیرے میں ٹٹول رہے ہوں اور انہیں کسی بھیانک چیز کا دھڑکا لگا ہوا — میں نے ان لوگوں کے ساتھ اس طرح کی دو تین راتیں باہر بسر کیں، تاریک آسمان کے نیچے جس میں جھلملاتے ستارے ٹکے ہوئے تھے — ایک چھوٹا سا نشیب تھا جس کی گرم گود میں ہم لوگ لیٹے ہوئے تھے — اس کے اطراف بید اور ترکل کی گھنی جھاڑیاں تھیں، وولگا کے قریب ہونے کی وجہ سے

سی شام تھی اور اس نمناک دھندلکے میں سے گذرتی ہوئی کشتیوں اور اسٹیمروں کی روشنیاں جھلکتی دمکتی سنہری مکڑیوں کی طرح رینگتی ہوئی ہر طرف نظر آرہی تھیں — اوپر کو ابھرے ہوئے سیاہ ساحل پر رات کے ٹونہرے اور راتیں سی بکھری ہوئی نظر آتی تھیں —— یہ خوشحال لوگوں کے بنگلوں، مکانوں اور شراب خانوں کی کھڑکیاں تھیں۔ اسٹیمروں کے پہیے [illegible] آہستہ آہستہ چھپاچھپ پانی پر لگتے جاتے، بجروں کی قطاریں [illegible] کو ملاح کھیتے اور ان کی بہتی ہوئی آوازیں بھنوروں کی گونجوں کی طرح معلوم ہوتیں۔ کہیں کوئی ہتھوڑا لوہے پر بجتا ہوا، ایک درد بھرا گیت پانی پر تیرتا ہوا آجاتا —— کسی کا دل، کسی کی روح مدھم مدھم سسک رہی تھی — یہ سب سن کر ہمارے دلوں پر بھی راکھ کی سی افسردگی چھا جاتی —

اس سے بھی زیادہ افسردگی اپنے ساتھیوں کی بات چیت سن کر ہوتی تھی۔ زندگی پر بحث کرتے ہوئے ہر شخص وہ بات کہتا جو اس کے اپنے دل سے قریب ترین ہوتی، دوسروں کی بات جیسے وہ سنتا ہی نہیں تھا — بید کی جھاڑیوں کے سائے میں لیٹے یہ لوگ سگریٹ پیتے جاتے، کبھی کبھی ایک آدھ گھونٹ بیئر یا واڈکا بھی لے لی جاتی لیکن بغیر کسی شوق یا ہوس کے، اور یادوں کے مبہم راستوں پر ذہن بھٹکتے رہتے —

کوئی کہتا ''تو میرے ساتھ یہ ہوا، مجھ پر یہ بیتی،،—— اس کی آواز رات کی تاریکیوں میں سے یوں پھوٹتی جیسے کسی نے اس کو زمین پر پٹک کر اس کا گلا دبا رکھا ہو — اور جب وہ اپنی داستان ختم کر چکتا تو دوسرے ہاں میں ہاں ملاتے ''ہاں، ہاں — ایسا ہی ہوتا ہے — کچھ بھی ہونا اس دنیا میں ممکن ہے ....،،

''یہ ہوا،، ''یہ ہو رہا ہے،، ''یہ ہوا کرتا تھا،،—— یہ فقرے میرے کانوں میں گونجا کرتے یہاں تک کہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا کہ آج کی رات یہ لوگ زندگی کے آخری گھنٹے شمار کر رہے

ہو — جو کچھ ہوتا ہے وہ خود بخود ٹھیک [illegible] اسے عجیب [illegible] ہوگا —

ان خیالات کی وجہ سے میں دشکن اور ہروسیوف سے کسی قدر دور ہو گیا — پھر بھی مجھے ان میں دلچسپی محسوس ہوتی تھی اور میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کا منطقی نتیجہ یہی ہوتا کہ میں بھی ان کے راستے پر چلنے لگتا — میرے دل میں جو لگن اور امید تھی کہ اونچی باتوں تک سوچوں، تعلیم حاصل کروں — اس امید نے ہی مجھے ان کے راستے سے بچے رہنے پر مجبور کیا — بھوک، بدحالی اور مایوسی کے لمحوں میں میں نے اپنے آپ میں جرائم کرنے کی مکمل صلاحیت پائی اور وہ بھی صرف "ملکیت کے مقدس تصور" کے سلسلے میں نہیں بلکہ اور چیزوں کے متعلق بھی! لیکن میری طبیعت میں دیوانگی کی جو رومانیت تھی اس نے مجھے اس راستے سے الگ نہ ہونے دیا جس پر چلنا میرا مقدر اور مقسوم تھا! بریٹ ہارٹ کی تحریریں میں نے پڑھی تھیں اور اس کی انسان دوستی سے متاثر تھا — اور بھی بہت سے سستے ناول پڑھے تھے اور اس کے علاوہ ایسی بھی بہت سی کتابیں پڑھی تھیں جو واقعی سنجیدہ تھیں — ان سے مجھے اور بہت سی باتیں حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا تھا، ایسی چیزیں جن کا تصور ابھی ذہن میں مبہم تھا لیکن چاروں طرف مجھے جو چیزیں نظر آتی تھیں ان سے وہ زیادہ بلند اور عظیم محسوس ہوتی تھیں —

اسی دوران میں ایک نئی قسم کی دوستی بھی میں بڑھا رہا تھا اور نئے قسم کے تاثرات حاصل کر رہا تھا — اسکولوں کے لڑکے اکثر ابوزسوف کے گھر کے پاس والے میدان میں جمع ہوتے اور گلی ڈنڈا کھیلا کرتے — اور میں ان لڑکوں میں سے ایک سے بہت قریب ہو گیا تھا — اس کا نام گوری پیتنسوف تھا — پختہ رنگ، جاپانیوں کے سے نیلے کالے بال، چہرے پر سیاہ سیاہ نکتے جیسے کسی نے جلد میں بارود رگڑ دی ہو — وہ بڑا خوش باش تھا، کھیلنے میں تیز، گفتگو میں

خوبصورت اور ماہر جولاہے، جو اس میں کئی صلاحیتیں [illegible] [illegible] حد تک اسے اپنی عورتوں سے ملی تھیں، زندہ دل باہنر روسی لوگوں کے مانند وہ بھی فطرت کی دین کا مالک تھا اور اپنی صلاحیتوں کو جتانے کا ذکر کی کوئی کوشش نہیں کرتا تھا — اسے موسیقی کا ذوق تھا، تب ہی موسیقی سے لگاؤ ہے، موسیقی کو سمجھتا بھی خوب تھا اور گوسلی، بلالائکا اور اکارڈین خوب بجاتا تھا، گاتا اور رقص [illegible] اور [illegible] سیکھنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ غریب تو وہ تھا ہی، [illegible] سے [illegible] سے بڑھاپے سے [illegible] ہو [illegible] اس کی بھی اور ملی [illegible]، [illegible] کے گانے سنوں اور [illegible] کے [illegible] سے [illegible] کو سنتے ہوئے جو اس کی [illegible] طبیعت، وسیع میدانوں، [illegible] اور اپنے ہونے محبوبہ [illegible] کے ساتھ خوب میل کھاتے تھے—

اس کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے اس کی کوئی بہت بڑی اور کشیدہ [illegible] سے ہو، جیسے کوئی [illegible] ہے جو ابھی ابھی [illegible] بعد سے رہا ہوا ہے — زندگی جو نعمت بھی اس کے سامنے حاضر کرتی وہ اسے نیا اور اچھا لگتا، ہر ہر بات پر وہ خوشی سے چہچہے لگاتا، گویا وہ دنیا میں اس طرح گھومتا پھرتا ہے جیسے کوئی نشہ سا ہوا ہو تھرک رہا ہے—

جب اسے معلوم ہوا کہ میری زندگی کس قدر مشکل اور خطرناک ہے تو اس نے یہ تجویز پیش کی کہ میں اس کے ساتھ جا کر رہوں اور اس طرح تعلیم حاصل کروں کہ کوئی ہنر سیکھ سکوں۔ چنانچہ یوں میں غریبوں کے اس عجیب وغریب، رنگین و دلچسپ ٹوٹے پھوٹے پرانے محلے میں جا کر رہا جس کا نام [illegible] تھا — ایک ایسا نام جو قزان کے طالب علموں کی کئی بستیوں کے لئے جانا پہچانا تھا — یہ

---

* گوسلی اور بلالائکا —— تاروالے لوک ساز — (اڈیٹر)

عمارت قریب قریب [illegible] ہو چکی تھی اور [illegible] سڑک پر واقع تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے [illegible]، [illegible] بہت سے [illegible] کے [illegible] سے اس کے اصلی [illegible] ہو گئے اور اب اس میں [illegible] رہتی تھیں۔

[illegible] کے [illegible] جو ایک کوٹھری جیسی [illegible] بھی [illegible] اس میں رہتا تھا۔ [illegible] کے [illegible] ہوا [illegible] سرے پر [illegible] میں [illegible] کے [illegible] لگی ہوئی تھی اور [illegible] کرسی — یہی کل سامان تھا — اس [illegible] سے [illegible] دو بڑے [illegible] تھے — دو میں رنڈیاں رہتی تھیں اور تیسرے میں ایک [illegible] رہتا تھا۔ جس کو [illegible] تھا — [illegible] میں [illegible] تھا — [illegible]، [illegible]، [illegible] سرخ روشن جیسے [illegible] کی [illegible] اور [illegible] سے [illegible] ہوئے کہ بمشکل اس کے چہرے کو چھپا سکتے تھے — [illegible] ابروؤں کے [illegible] سے اس کی [illegible] اور [illegible] جھانکتی [illegible] ایسا لگتا تھا کہ اسے [illegible] ہوئی اس [illegible] کے سوا کچھ نہیں ملا تھا کیونکہ اس نے [illegible] رکھے تھے — رات دن وہ [illegible] کے [illegible] رہتا، [illegible] اور [illegible] رہتا — اس کی کھانسی بے جان اور تھکی ہوئی برابر گونجتی رہتی — رنڈیاں اس کو پاگل سمجھ کر اس سے ڈرتی نہیں تھیں لیکن [illegible] اس کے دروازے کے پاس چائے، شکر، روٹی وغیرہ چپکے سے رکھ دیا کرتی تھیں — وہ باہر نکلتا اور ان بنڈلوں کو اٹھا لیتا — اتنا ہی کرنے سے وہ گھوڑے کی طرح ہانپنے لگتا — اگر کبھی وہ لوگ بھول جاتیں یا کسی وجہ سے نہ [illegible] رکھ پاتیں تو وہ اپنے دروازے پر کھڑا ہو کر پھٹی ہوئی آواز سے، کھانسنے میں [illegible] نکال کر چلاتا "کھانا!"

اس کی آنکھیں [illegible] گڑھوں میں اس طرح چمکتیں

جیسے پاگلوں کی طرح سے اس وقت چمکتی ہیں جب وہ اپنے آپ کو بادشاہ معظم سمجھتے ہیں — کچھ وقفہ دینے پر ایک کبڑا بھی اس سے ملتے [illegible] کرہ تھا جس کی ایک ٹانگ ٹیڑھی تھی — اس کا سارا جسم بے ڈھب تھا، پھولی ہوئی ناک پر ایک موٹے شیشوں کی عینک رکھی رہتی تھی، زنخوں کی طرح کے [illegible] ہوئے چہرے پر چالاک مسکراہٹ چھائی رہتی تھی — دونوں کے دونوں کمرے کے دروازے بند کئے گھنٹوں خاموشی سے بیٹھے رہتے اور کمرے پر ایک عجیب سا سناٹا چھایا رہتا۔ ایک بار کئی رات گئے میں ایک دم اس ریاضی دان کی آواز سے جاگ پڑا — وہ چیخ رہا تھا:

''میں کہتا ہوں کہ یہ جیومیٹری جھوٹ ہے یا یہ [illegible] ہے معجزہ ہے، بس ہے یہ جیومیٹری! [illegible] ہی [illegible] ہے — [illegible] جھوٹے دان ہے جھوٹے دان — [illegible]!''

اور وہ کبڑا [illegible] ہنسے جا رہا تھا اور ایک عجیب سے فقرے بار بار دوہرائے جا رہا تھا جیسے میں بہرہ [illegible] تھا — پھر ایک ریاضی دان زور سے چلایا:

''جہنم میں جاؤ تم! دفع ہو یہاں سے!''

کبڑا بڑبڑ کرتا، غصے میں بڑبڑاتا، [illegible] ہوا کمرے سے ہو کر کھسک لیا — اور ریاضی دان اپنے کمرے کے دروازے پر رک گیا۔ لمبا، دبلا، ڈراونا اور اپنے الجھے ہوئے بال نوچ نوچ کر ھنہنانے لگا:

''افسوس گدھا ہے! احمق ہے! میں ثابت کر سکتا ہوں کہ اس گدھے یونانی سے تو پروردگار ہی زیادہ عقلمند ہے!''

پھر وہ اندر چلا گیا اور جاتے ہوئے اس زور سے دروازہ بند کیا کہ کمرے میں کوئی چیز جھٹکے کے ساتھ زمین پر آ رہی —

جیسا کہ مجھے آخرکار معلوم ہوا یہ آدمی خدا کے وجود کو اعلیٰ ریاضی کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا — آخرکار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے بغیر ہی مر گیا —

پلیتنیوف ایک چھاپے خانے میں، ایک اخبار کا رات کا پروف ریڈر لگا ہوا تھا — اس کو گیارہ کوپک روزانہ ملتے تھے۔ اگر مجھے کوئی مزدوری نہ ملتی تو ہم لوگ دو سیر کی ڈبل روٹی پر، دو کوپک کی چائے اور تین کوپک کی شکر — اور اسی پر گزارہ کرتے۔ ویسے میرے پاس روپیہ کمانے کے لئے وقت بھی بہت کم تھا، کیونکہ مجھ کو پڑھنا ہوتا تھا اور پڑھنے میں مجھے بہت محنت کرنی پڑ رہی تھی! مجھ پر سب سے زیادہ بار قواعد کا ہوتا تھا، اس کے طریقے صرف النحو طور پر محدود اور جکڑے ہوئے تھے اور مجھے یہ امر ناممکن نظر آتا تھا کہ روسی زبان کو گلا گھونٹ کر ان قواعد کے خولوں میں کیسے فٹ کروں — روسی زبان جو کہ زندہ، اتنی وسیع اور اتنی پیچیدہ تھی — جلد ہی مجھے یہ معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوا کہ میں نے ابھی مطالعہ کافی جلد شروع کر دی تھی کہ اگر میں دیہات کے مدرسوں والا امتحان پاس بھی کر لوں تب بھی مجھے نوکری ابھی نہیں مل سکتی تھی کیونکہ میری عمر کم تھی —

پلیتنیوف اور میں ایک ہی پلنگ پر سوتے تھے — میں رات کو اور وہ دن کو — جب وہ صبح تڑکے، رات بھر کے کام سے تھک کر گھر آتا تو اس کا رنگ اور بھی سنولایا ہوا لگتا، آنکھیں سرخ ہوتیں — میں فوراً پاس کے شراب خانے سے دوڑ کر گرم پانی لاتا — سماور تو ہمارے پاس تھا ہی نہیں — پھر ہم لوگ کھڑکی کے قریب والی میز پر چائے اور روٹی کا ناشتہ کرتے — پلیتنیوف صبح کے اخبار کی خبریں سناتا جاتا اور لطیفے اور مزاحیہ نظمیں جو ایک شرابی کالم نگار لکھتا تھا — اس کا قلمی نام "سرخ ڈومینو" تھا — پلیتنیوف جس طرح زندگی کی طرف ایک خوش باش رویہ رکھتا تھا اس پر مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی — وہ زندگی سے اسی طرح پیش آتا تھا جیسے اس گول مٹول چہرے والی عورت گالکینا سے پیش آتا تھا جو عورتوں کے کام کی سیکنڈ ہینڈ چیزیں اکٹھی کرتی اور بیچتی تھی —

مسعود نے ریہرسل کے بیچ ہی میں جبکہ اسی عورت نے ڈرامے پر حسرت کی تھی ۔ اور چونکہ اس کے پاس اس لعنت کا ڈرامہ ادا کرنے کا سلیقہ نہیں ہے اس لئے وہ معاف کر دیئے، ادراکین کے موسیقی جھٹکے اور جھنجھلاہٹ کے بعد ڈرامہ ادا کیا گیا اور یہ ڈرامہ وہ بہت ہی مسکرا مسکرا کر آنکھوں میں طنز کی روشنیاں جھلکاتے ہوئے ادا کرتا تھا۔ یہ عورت لاکھ اپنی جوانی میں بھی بے حد حسین رہی ہو گی او اب تو اچھی آواز کی پہچان اور قدر بھی [illegible] مگر اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے، ننھے ننھے قطرے جن کی بے حد الجھنوں سے نکلے اور پھولے ہوئے سرخ سرخ گالوں پر ڈوبتے ۔۔۔ سرخ پھولے پھولے دل کو سہلاتے اور سہلاتے ہوئے کی حالت سمجھ میں نہیں ۔ جھکی سی انگلیوں سے وہ ٹکڑوں کر کے آنسو پونچھتی، پھر آنکھیں کو بڑی احتیاط سے ایک چکٹ رومال سے پونچھتی —

"سوری، آہ، سوری، [illegible] میں پھر تم نہیں [illegible] سچ مچ مسرور ہو [illegible] ٹھیک ہے بڑا خوبصورت اور عمدہ [illegible] میں تمہیں چھوڑا چاہتا [illegible] میں نے [illegible] ان عورتوں کے [illegible] جوڑ ملاتے ہیں [illegible] ایک ہی جیسی زندگی سے [illegible] ۔۔

ان جوانوں میں سے ایک جوان جو لوگوں کے بالکل درمیان میں رہتا تھا وہ طالب علم تھا — اس کا [illegible] معاف کرنے والے کی حالت سے نہیں [illegible] نوجوان کا قد درمیانہ تھا، سینہ چوڑا اور جھکی ہوئی رانیں — وہ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی مسلسل اپنی اوپری نوک پر تھوڑا گر دیا گیا ہو اور وہ نوک جھکنت دی گئی ہو — اس کے ہاتھ عورتوں کی طرح نازک اور چھوٹے چھوٹے تھے — سر بھی جو کندھوں میں گھسا ہوا لگتا تھا چھوٹا ہی سا تھا، جس پر سخت موٹے چھدرے بال تھے جیسے ٹوپی سر پر منڈھی ہوئی ہو — پیلے، نچڑے ہوئے چہرے میں سے سبزی مائل آنکھیں آگے کو ابلی ہوئی لگتی تھیں —

[illegible] نے نہایت [illegible] سے [illegible] کی طرح [illegible] رہ رہ کر اور [illegible] کی ہوتی ہیں۔ [illegible] باپ کی مرضی کے خلاف کسی نہ کسی طرح ہائی اسکول کی تعلیم ختم کرکے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ امتحان [illegible] کرنے کے بعد اس کو پتہ چلا کہ اس کی آواز نہایت [illegible] اور عمدہ ہے تو وہ موسیقی سیکھنے کی طرف مائل ہو گیا —

ڈاکٹر [illegible] اور اس کے لئے اپنی ایک گاہک کو [illegible] وہ [illegible] عورت تھی، کوئی خاص [illegible] ہوگا، ایک [illegible] یونیورسٹی کے تیسرے سال میں پڑھتی تھی، ایک لڑکی ہائی اسکول کی آخری جماعت میں پڑھ رہی تھی [illegible] اس طرح [illegible] لمبی [illegible] جیسے [illegible] تھی، اور اس کا چہرہ اس طرح جذبات سے خالی تھا جیسے [illegible] کا — بڑی بڑی آنکھیں [illegible] میں [illegible] تھیں، [illegible] پر ایک [illegible] اور کانوں میں [illegible] گہرے سبز رنگ کے نگ جڑے تھے —

[illegible] صبح کو اول وقت یہ عورت اپنے [illegible] کو [illegible] کرتی ہوئی نکلتی تو میں [illegible] کو دیکھا [illegible] دروازے سے [illegible] میں داخل ہوتی اور بڑی [illegible] کے [illegible] اندھیرے میں سے گذرتی ہوئی ادھر سے ادھر چلی گئی۔ اس کے چہرے پر کوئی ایسی بات نہیں جس سے [illegible] لگتا تھا۔ ہونٹ اپنے [illegible] اور یوں بھنچے ہوئے جیسے کہ ہیں ہی نہیں۔ آنکھیں [illegible] سی کھلی رہتیں مگر [illegible] لگتا کہ ان سے کچھ سوجھ نہیں رہا ہے — ان آنکھوں میں مایوسی اور ناامیدی کی پرچھائیاں ہوتیں اور وہ ہمیشہ آگے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی چلی جاتیں — ویسے اس کو بد صورت نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن جو تناؤ کا عالم اس پر ہر وقت طاری رہتا تھا اس کی وجہ سے اس کی ہیئت بگڑی رہتی تھی، عضلات کھنچ جاتے تھے، نقوش سکڑ جاتے تھے۔ بلسنوف کہتا:

''دیکھو وہ چلی جا رہی ہے جیسے کوئی دیوانی عورت ہو!''

اس وقت علم ہوتا کہ اس عورت سے نفرت تھی، ہمیشہ جل جانے کی کوشش کیا کرتا تھا اور وہ جاسوس کی طرح اس کا پیچھا کیا کرتی تھی، ایک قرض مانگنے والے شخص کی طرح۔ جب وہ تھوڑی بہت شراب پی لیتا تو وہ رو رو کر کہتا:

''اوہ، میں تو ایک فن کار ہوں اب — اس موسیقی سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ اس صورت اور اس جسم کے ساتھ تو لوگ مجھے اسٹیج کے پاس تک بھی نہیں پھٹکنے دیں گے!''

[illegible] 'جیمز' نے بارہا معذرت قبول کی..

''ارے میں [illegible] ہوں — مگر مجھے اس بیچاری پر ترس آتا ہے [illegible]، میں اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا اور مجھے اس پر ترس آتا ہے — ہم تو لوگ [illegible] نا معلوم کہ وہ [illegible] کس طرح......''

لیکن ہم لوگوں کو سب معلوم تھا — ہم نے راتوں کو اس عورت کو رونے کے درد بھرے نغمے، اور جانے والی سڑکوں کے پاس ٹھوکریں، [illegible] کی جان واز میں روتے سنا تھا ''خدا کے واسطے... اسے میرے دفتر [illegible] واسطہ... اے میری جان!''

وہ ایک بہت بڑی فیکٹری کی مالک تھی، اس کے پاس جائداد تھی، گھوڑے تھے، ہزاروں روپئے وہ لڑکیوں کے اسکول کو عطیہ دیتی تھی اور وہ فقیر کی طرح بھیک مانگتی تھی —— محبت کی بھیک!

ناشتے کے بعد بدتشوف عام طور پر سو جاتا تھا، میں کام کی تلاش میں نکلتا تھا اور شام کو اسی دیر میں لوٹ کر آتا کہ اس کے دفتر جانے کا وقت ہو جاتا — اگر میں کھانا لے آتا —— روٹی، کباب یا ابلی ہوئی مچھلی —— تو ہم دونوں مل بانٹ کر کھا لیتے اور تھوڑا سا وہ باندھ کر اپنے ساتھ لے جاتا۔

جب وہ چلا جاتا تو میں گلیاروں میں ادھر ادھر ٹہلتا، باہر احاطے

میں نکل جاتے اور ان لوگوں کی زندگیوں کو قریب سے دیکھتے جو ابھی مرے نہیں تھے اور اجنبی تھے ۔ یہ بوڑھی عورت [illegible] تھی جسے ایک بڑے [illegible] ہوا [illegible] کے وجود سے اسی [illegible] اور [illegible] مہک [illegible] جس کے [illegible] کچھ نہیں سکتا ہے کہ [illegible] چھوڑتے رہتے تھے ۔ وہ [illegible] میں [illegible] مسلمانوں کی [illegible] سے [illegible] تک زندگی کی [illegible] جاری رہتی : [illegible] کی [illegible] مصر کی [illegible] کی [illegible] اور [illegible] کی جاری آواز [illegible] کے [illegible] کی [illegible] میں [illegible] مصر کی [illegible] ہر مرنے والے میں ایک سوال [illegible] جس کا جواب [illegible]

"آخر اس [illegible] کا [illegible]

نوجوان [illegible] کی [illegible] میں [illegible] اور آدمی تھا جو [illegible] ایک [illegible] چکما [illegible] اور اس کے [illegible] طرف چھوٹے چھوٹے بال [illegible] جیسے [illegible] نکلا ۔ [illegible] کے [illegible] ابھری ہوئی اور [illegible] جس میں گھوڑوں کے سے [illegible] دانت! ان ہی دانتوں کی وجہ سے اس کا نام "لال گھوڑا" پڑ گیا تھا — وہ ایک دیوانی کے مقدمے میں پھنسا ہوا تھا جس کو چلتے ہوئے اب تیسرا سال تھا — یہ مقدمہ وہ اپنے چند رشتہ داروں کے خلاف لڑ رہا تھا جو سمرسک میں سوداگر تھے — وہ ایک ایک کو سنا کر کہتا:

"ارے میں تو مر ہی جاؤں گا مگر ان لوگوں کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا — آخری کوپک تک لٹوا دوں گا، فقیر بنا دوں گا کہ بھیک مانگتے پھریں گے — اور پھر جب وہ نو سال [illegible]

میں نے تو بس وہ کچھ مقدمے سے جیتوں گا سب ان کو واپس دے دوں گا اور [illegible] اب کسی [illegible] دیکھ سکتا ہوں، میں!..

'اور تمہاری زندگی کا [illegible] مقصد تھا؟' [illegible] اس سے لوگ پوچھتے۔

'میرا پورا وجود، میری روح اسی مقصد میں ڈھل گئی ہے۔ میں اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں سوچ سکتا..'

وہ شمع [illegible] یا [illegible] گھروں میں [illegible] اپنے [illegible] میں اپنی زندگی گذار [illegible] کسی [illegible] کو [illegible] میں [illegible] شروع [illegible] — [illegible] پوچھے، [illegible] اور [illegible] ایسے کمرے میں [illegible] پڑا ہوا ہے اور جب [illegible] رہی تھی، وہ زور و شور کی [illegible] سب [illegible] اور اور لوگ بھی اس میں [illegible] ہوتے [illegible] جو [illegible] پھر [illegible] اور لوگ پھر [illegible] جاتے، تھے اور شریک ہوتے تھے — [illegible] خود [illegible] رہ [illegible] اپنے [illegible] کھڑے [illegible] اور [illegible] اٹھا [illegible] کے بعد وہ زور زور سے رونا شروع کرتا:

'اے میری [illegible]، اے میرے محبوب [illegible] میری [illegible]! میں ان لوگوں سے [illegible] کرتا ہوں! یہ لوگ [illegible] ہو — میں [illegible] معاف [illegible] ہوں [illegible] مگر [illegible] مجھ [illegible] ہوں، مگر [illegible] میں اپنے [illegible] داروں [illegible] کرنے [illegible] ہوا ہوں [illegible] میں ان [illegible] کر کے ہی رہوں گا! ہاں، دیکھ لینا — خدا کی قسم ہے، خدا گواہ ہے — ہاں [illegible] کر دوں گا! ہاں، [illegible] ہے ہی مجھ کو مگر....

اس کی سوجی ہوئی، مچمچی ہوئی آنکھوں سے شراب کے آنسو اس کے بدصورت اور عجیب و غریب چہرے پر بہنے لگتے، [illegible] سے وہ گالوں پر بہتے آنسو پونچھتا اور پھر اپنے ہاتھ [illegible] پر

سر رکھ کر سوچتا رہتا — اس کے بچوں پر [illegible] [illegible] ملے ڈھکے پڑے رہتے تھے —

''اُف، تم کیسی زندگی بسر کرتے ہو... وہ چیخ چیخ کر کہتا۔ بھوک سے مرتے ہو، سردی سے ٹھٹھرتے ہو، جسم پر چیتھڑے ہیں — کیا یہ ٹھیک ہے؟ اس طرح زندگی بسر کرتے ہم نہ سکیں گے؟ کیا [illegible] نہیں؟ آہ، کاش اگر کو معلوم ہوتا کہ تم کس طرح زندگی گذارتے ہو...''

پھر وہ اسی جیب سے ایک میلا چیکٹ چمکدار رقعہ نکالتا اور زور سے چیختا:

''بس نو چھٹے روپیہ، ارے مرے بھائیو! یہ رہا روپیہ — یہ لو!''

دوستوں اور دیے والی لڑکیاں لپکتیں اور اس کے ہاتھ سے نوٹ چھیننے کی کوشش کرتیں۔ وہ فوں فوں کرکے کہتا:

''ارے تمہارے لئے نہیں ہیں! یہ طالب علموں کے لئے ہیں!''

لیکن صاحب علم اس کا روپیہ کبھی نہیں لیتے تھے۔ سمور صاف کرنے والے کا لڑکا غصے میں بھر کر کہتا:

''جہنم میں جائے یہ روپیہ! لعنت ہے اس پر!''

ایک مرتبہ وہ شراب کے نشے میں بے خود ہو کر بلتسنوف کے لئے دس دس روبل والے نوٹوں کی ایک گڈی لئے پہنچا — یہ گڈی کیا تھی، مڑے تڑے نوٹوں کی ایک گندی سی پوٹلی تھی۔ اس گٹھڑ کو میز پر پھینک کر وہ بولا:

''لو، چاہئیں؟ مجھے تو نہیں چاہئیں...''

پھر وہ ان نوٹوں کے پلنگ پر لیٹ کر اسے زور زور سے رونے لگا یہاں تک کہ نوکروں نے زبردستی اس کے منہ پر پانی چھڑکا اور پلایا — جب وہ سو گیا تو بلتسنوف نے نوٹوں کی شکنیں برابر کرنا شروع کیں — لیکن پانی سے تر نشے بغیر نوٹوں کو سیدھا کرنا بالکل ناممکن نظر آتا تھا —

[illegible] دھنوں پر [illegible] خاصا [illegible] دھوئیں سے اٹا ہوا، پھر نشان ادھر کو کھینچتی ہوئی جدھر دوسری عمارت کی بلند دیوار کھڑی تھی — لوگ اس کمرے میں بیٹھا [illegible] بیٹھے ہوئے، ہوا کا ذکر نہیں، جیسے [illegible] جیسے خواب [illegible] اور پھر ویرا نے "کھوڑے" کے کمرے میں اس سے پوچھا:

"آپ آخر یہاں کیوں رہتے ہیں — کسی شہر میں کیوں نہیں رہتے آپ؟"

"ارے میری جان، یہ دل کی خاطر یہاں رہتا ہوں [illegible] میرے دل کو ذرا حوالاتی نصیحت ہوتی ہے، یہاں [illegible] کی صحبت میں..."

سمور [illegible] کرتے ہوئے [illegible] اتفاق کرتے ہوئے کہا:

"آپ ٹھیک کہتے ہیں 'کھوڑے' صاحب — میرا بھی یہی مطلب ہے — کوئی اور جگہ ہو تو میرا خاتمہ ہو جائے...."

"کھیرا"، [illegible] سے [illegible] کے تعجب سے کہا:

"آؤ آؤ، مجھے بچاؤ — کچھ بجاؤ، کچھ گاؤ۔"

اور پھر پلیتیزوف [illegible] پر کوئی رکھ دیا اور شروع کر دیا:

دھکتے سورج، ابھر...

اس کی میٹھی آواز فوراً دل کو چھو لیتی۔ کمرے [illegible] جب جاتی، سب لوگ بیٹھے گانے کے دردبھرے بول غور سے سنتے اور کرسی کے تاروں کو تڑپتے ہوئے دیکھتے رہتے۔

اس امیر سوداگر عورت کا محبوب کہتا "کیا خوب چیز ہے، لعنت ہے اس پر!"

جس طرح پریوں کی داستانوں کا ایک کردار [illegible] ہوتا ہے جو نیک اور عقلمند ہوتا ہے اور سب کے کام آتا ہے، اسی طرح اس [illegible] عمارت کی بستی میں [illegible] کی ذات تھی جیسے [illegible]

نہ دور آیا تھا۔ اس کی صحت جوانی کی ڈھلتی رگوں میں رینگتی اور رچی ہوئی تھی۔ ہنسی مذاق کرکے، حسین کلمے کہہ کے، انسانی عقیدوں، قاعدوں اور رسموں کا پرلطف مذاق اڑا کے اور زندگی کی بے انصافیوں پر بے دھڑک تبصرہ کرکے وہ اپنے چاروں طرف مسلسل بھنبھناہٹ سی چھوڑے رہتا تھا۔ اس کی عمر کا صرف ستھواں سال تھا لیکن اس عمارت میں جتنے بھی لوگ رہتے تھے، ان کو جب زندگی کسی طرح بھی دباتی یا کوئی بھی صلاح مشورہ ان کو کرنا ہوتا تو وہ اسی کا آسرا لیتے جیسے وہ کسی نہ کسی طرح ضرور اس مسئلے کو حل کر دے گا۔ جو لوگ اچھے تھے وہ اس سے محبت کرتے تھے اور جو برے تھے وہ اس سے ڈرتے تھے۔ یہاں تک کہ بڈھا پولیس والا نکیفورچ بھی کوری کو دیکھ کر مکار لومڑی کی طرح مسکرا دیتا تھا۔ ''ماروسوفکہ،، کا احاطہ پہاڑی پر چڑھتا چلا گیا تھا اور دو سڑکوں کو ملاتا تھا۔ نچلی سڑک کا نام رستوژدیسکایا تھا اور اوپری کا نام استرولورشنایا تھا۔ اس دوسری سڑک کے نکڑ پر جو ہمارے پھاٹک سے بہت دور نہیں پڑتا تھا، نیکیفورچ کی کوٹھری تھی۔

وہ ہمارے اطراف کا سب سے اونچا پولیس والا تھا۔ لمبا قد، دبلا پتلا جسم، سینے پر چمکدار تمغوں کی قطار۔ اس کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی، منہ میں کھلی ہوئی مسکراہٹ اور تیز ہوشیار آنکھیں!

ہماری شوروشروالی بستی میں رہنے والوں سے نیکیفورچ کو خاص دلچسپی تھی، ان انسانوں سے جن کی زندگی پیچھے رہ گئی تھی اور ان انسانوں سے بھی جن کی پوری زندگی پڑی تھی۔ دن میں کئی کئی بار اس کا سلیقے سے سجا ہوا جسم ہمارے پھاٹک کے آس پاس منڈلاتا نظر آتا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ احاطے میں جاتا اور چلتے چلتے ہر کھڑکی میں اس طرح جھانکتا جیسے چڑیا خانے کا منتظم پنجروں کا معائنہ کر رہا ہو۔ جاڑوں میں ہمارے یہاں سے دو آدمی گرفتار ہوئے تھے ـــ سمیرنوف جو ایک فوجی افسر تھا اور جس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا

تھے، اور موراٹوف، جو معمولی سپاہی تھا ۔۔ یہ دونوں خاص ٹکڑی کی مدد میں شریک ہو گئے تھے جس کی سرکردگی اسکوبلیف نے کی تھی ۔ دونوں مارے گئے تھے اور سینٹ جارج کا تمغہ آویزاں تھا ۔۔ ان لوگوں کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے ـــــ زونتن، اوفسیانکن، کرافوریف، کرینوف اور دو کچھ لوگ ۔۔ ان لوگوں کو ایک حصہ چھاؤنی جلانے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا اور اسی سلسلے میں موراٹوف اور سیمیونوف نے [illegible] شہر کی ایک بہت ہی تنگ اور تاریک سڑک پر بندوقچیوں کے گھیرے سے چھپائے جانے سے کچھ بات کرنے کی کوشش کی تھی ۔۔ اور یہیں پر وہ دونوں گرفتار ہوئے تھے۔ پھر ایک رات "[illegible]"، میں پولیس نے ایک چھاپہ مارا۔ افسردہ آدمی کو گرفتار کیا جس کو میں "خفیہ تیرہ نمبر" کہا کرتا تھا۔ جب دوسرے دن یہ بات پھیلی تو [illegible] نے مجھ سے اپنے [illegible] بال الجھا الجھا کے کہا:

"دیکھو، [illegible] بس بات یہ ہے تو، [illegible]، [illegible]..."

اور پھر مجھے یہ سمجھا کر کہ کہاں جانا ہے اس نے کہا:

"البتہ ذرا ہوشیار رہنا، آس پاس جاسوس ضرور ہوں گے!"

میں اس پر اسرار مشن کے سپرد کئے جانے پر پھولا نہ سمایا اور بہت تیزی سے اس محلے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں [illegible] آ کر ٹھہرے تھے۔ یہاں ایک لوہار کی دوکان تھی اور اس دوکان میں ایک نوجوان آدمی تھا جس کے بال گھنگھریالے تھے، آنکھیں بڑے غضب کی نیلی تھیں، وہ ایک تانبے کی کڑاہی مرمت کر رہا تھا لیکن دیکھنے میں مزدور نہیں لگتا تھا۔ کونے میں ایک بڈھا جس کے سفید بال چمڑے کے فیتے سے پیچھے کو بندھے ہوئے تھے، میز کے پاس کھڑا نال کو ٹھیک ٹھاک کر رہا تھا۔

میں نے پوچھا:

’’یہاں نوکری ہے؟ یہاں کام مل سکتا ہے؟،،

بڈھے لوہار نے غرا کے جواب دیا:

’’کام بہت ہے مگر تمہارے لئے نہیں!،،

نوجوان نے ایک نظر مجھے جلدی سے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ میں نے پھرتی سے اس کے پاؤں میں اپنے پاؤں سے ایک ٹھوکا دیا۔ اس نے بگڑ کر حیرانی سے مجھے دیکھا اور کڑاہی کا ہینڈل پکڑ کر زور سے تانا جیسے مارے گا۔ لیکن مجھے آنکھ مارتے دیکھ کر بولا:

’’باہر جاؤ، باہر...،،

میں نے پھر آنکھ ماری اور دوکان سے باہر نکل آیا۔ گھنگھروالے بالوں والا لوہار اٹھا، اکڑے ہوئے جسم کو سیدھا کیا اور میرے پیچھے پیچھے باہر نکلا۔ سگریٹ جلاتے ہوئے وہ خاموشی سے میری طرف مڑا اور منتظر رہا۔

’’کیا آپ تیخون ہیں؟،،

’’ہاں، ٹھیک ہے۔،،

’’پیوتر گرفتار ہو گیا۔،،

غصے سے اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ آنکھیں میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگیں۔

’’یہ تم کیا بک رہے ہو؟ کیسا پیوتر؟،،

’’وہ ایک لمبا لمبا سا آدمی جو پادری ایسا لگتا ہے۔،،

’’تو پھر؟،،

’’بس اور کچھ نہیں۔،،

’’لیکن اس پیوتر اور پادری اور تمہارے سب اٹھائی گیروں سے مجھے کیا مطلب؟،، اس نے ڈانٹ کر پوچھا۔ اسی انداز نے مجھ کو یقین دلا دیا کہ یہ آدمی کوئی معمولی مزدور نہیں تھا۔ گوری کا کام پورا کرکے میں اپنی کامیابی پر نازاں، خوش خوش گھر لوٹا۔ خفیہ، کاموں میں یہ میں نے پہلی بار حصہ لیا تھا۔

گوری مسٹوف کا ان معاملات سے تعلق تھا لیکن جب میں بھی ان میں شامل ہونے کی درخواست کرتا تو وہ اسے ہی کہتا:

''ارے بھئی، تو ابھی چھوٹا ہے۔ ابھی کتابیں دیکھ، پڑھنے کا دھیان کر...''

پھر ایورینوف نے ایک ایسے آدمی سے میرا تعارف کروایا جو ذرا پراسرار سا تھا — اس تعارف کے سلسلے میں اتنی احتیاط برتی گئی تھی کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ اب کے معاملہ واقعی اہم ہے — اس ملاقات کے لئے ایورینوف نے مجھے آرسکونے کے میدان میں بلایا — یہ شہر کی حدود کے باہر ایک بڑا سا میدان تھا — ایورینوف مجھ کو راستے میں برابر سمجھاتا رہا کہ اب جو ملاقاتیں ہونے والی ہیں ان میں مجھے بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور تمام باتوں کو بالکل پوشیدہ رکھنا ہوگا — آخرکار اس نے ایک بھورے ہیولے کی طرف اشارہ کیا جو ذرا دور پر آہستہ آہستہ اس سنسان میدان میں ٹہل رہا تھا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے کہا:

''یہی ہے وہ — اس کے پیچھے پیچھے جاؤ اور جب وہ رک جائے تو اس کے نزدیک جا کر کہنا 'میں نووارد ہوں'...''

پراسرار معاملات ہمیشہ ہی دلچسپ اور دلکش ہوتے ہیں لیکن یہ بات مجھے بڑی عجیب سی معلوم ہوئی: روشن اور گرم دن ہے اور ایک آدمی اکیلا میدان میں گھومتا پھر رہا ہے جیسے گھاس کا کوئی بھورا تنکا — اور بس کچھ نہیں — قبرستان کے پھاٹک تک پہنچتے پہنچتے میں نے اس کو جا لیا۔ دیکھا تو میرے سامنے ایک نوجوان تھا۔ پتلا دبلا چہرہ، سخت آنکھیں ایسی گول جیسی چڑیوں کی ہوتی ہیں، وہ اسکول کے لڑکوں کے یونیفارم کا سرمئی کوٹ پہنے تھا لیکن اس میں یونیفارم کے چمکدار دھات کے بٹنوں کے بجائے ہڈی کے سیاہ بٹن لگا دئے گئے تھے۔ گھسی ہوئی ٹوپی پر بھی اسکول کے نام کی جگہ ایک داغ دھبہ نظر آرہا تھا — غرض اس نے کچھ ایسی

وضع قطع بنا رکھی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا جیسے قبل ازوقت وہ اپنے کو بزرگ بنا دینے کی کوشش میں ہو۔

کبھی جھاڑیوں کے سائے میں قبروں کے پاس ہم دونوں بیٹھ گئے۔ مجھے نہ وہ خود اچھا لگا نہ اس کی کوئی بات۔ اس کے بات کرنے کا طریقہ بڑا ہی سردمہری کا اور کاروباری قسم کا تھا۔ پہلے تو مجھ سے بڑی سختی کے ساتھ پوچھتا رہا کہ میں نے کیا کیا پڑھا ہے، پھر مجھ سے کہا کہ اس نے مطالعے کی ایک انجمن بنائی ہے جس میں میں شامل ہو جاؤں۔ میں نے ہامی بھر لی۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ پہلے وہ گیا۔ جانے سے پہلے اس نے میدان پر ادھر ادھر ایک نظر ڈالی، پھر روانہ ہو گیا۔

اس انجمن میں ہم چار پانچ آدمی تھے۔ میں عمر میں سب سے کم تھا۔ اس کے علاوہ جان اسٹوارٹ مل اور اس پر لکھی ہوئی چرنی‌شیفسکی کی تفسیروں کو پڑھنے کے لئے جو ذہنی پس‌منظر ضروری تھا، وہ میرے یہاں سرے سے تھا ہی نہیں۔ ایک شخص تھا ملوفسکی۔ ان کے گھر میں ہماری یہ بیٹھکیں ہوا کرتی تھیں۔ وہ استادوں کے کالج کا طالب‌علم تھا اور بعد کو اپیونسکی کے قلمی نام سے مختصر افسانے لکھنے لگا تھا۔ جب وہ تقریباً پانچ مجموعے شائع کروا چکا تو اس نے خود کشی کرلی۔ میرے جاننے والوں میں سے نہ جانے کتنوں ہی نے اپنی پسند سے زندگی کو خیر باد کہا اور موت قبول کی!

ملوفسکی خاموش طبیعت انسان تھا، ڈر ڈر کر سوچتا تھا اور رک رک کر بولتا تھا۔ وہ ایک خراب و خستہ مکان کے تہہ‌خانے میں رہتا تھا اور ’’روح اور جسم کا توازن قائم رکھنے،، کے لئے بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ اس کی صحبت میں اکتاہٹ ہوتی تھی۔ جہاں تک جان اسٹوارٹ مل کا سوال ہے ان کو پڑھنے میں میری طبیعت بالکل نہیں لگی۔ معاشیات اور اقتصادیات کے جو بنیادی اصول انہوں نے بیان کئے ہیں وہ مجھے ایسے لگے گویا میں ان کو بالکل نزدیک

سے جیسا بوجھ تھا — میں نے ان اصولوں کے تجربے میں مہارت حاصل کی تھی اور ان کی چھاپ تو میری چھری پر موجود ہوتی — مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان بڑی بڑی کتابوں اور ان مشکل الفاظ کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی جبکہ ان میں صرف وہی باتیں بیان کی گئی ہیں جو ہر محنت کش انسان خود بخود ضرور جانتا ہو — جس انسان نے اس طرح محنت کی ہوگی کہ اس کی اپنی زندگی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگی آرام اور آسائش سے گزرے وہ مر مٹے اور دوسرے چین کریں! میرے لئے اس تہہ خانے میں بیٹھ کر لگاتار دو دو تین تین گھنٹے تک گوند کی مہک سونگھنا اور دیمک کو گندی دیواروں پر رینگتے ہوئے دیکھتے رہنا بڑی مصیبت تھی —

ایک دن ہمارا استاد مقررہ وقت پر نہیں آیا — ہم لوگوں نے سوچا کہ اب شاید وہ آئے گا ہی نہیں — لہذا ہم لوگ کچھ تفریح کرنے اور موج اڑانے کے موڈ میں آ گئے — ایک بوتل واڈکا آئی، تھوڑی سی ڈبل روٹی اور نمکین کھیرے! لیکن ابھی تک تھوڑے پلوں میں ہی ہوتی اس کی ٹانگیں ایک جھلک دکھاتی کھڑکی کے پاس سے سیڑھی سے اتریں اور ہم لوگوں کو بس اتنی مہلت مل سکی کہ واڈکا کی بوتل اس کے داخل ہونے سے پہلے ہم نے میز کے نیچے کھسکا دی۔ جتنی دیر تک وہ چرنی شیفسکی کے عالمانہ نکتے ہم لوگوں کو سمجھاتا رہا ہم لوگ احمقوں کی طرح یکساں سیدھے، اکڑے بیٹھے رہے — مجھے بھی ڈر لگا تھا کہ کہیں ہم میں سے کسی کا پاؤں بوتل میں لگے اور وہ گر جائے گی! آخر کار انجام یہ ہوا کہ ہمارے استاد ہی کا پاؤں اس میں لگا اور وہ گری — بوتل کے لڑھکنے کی آواز سن کر اس نے میز کے نیچے جھانک کر دیکھا مگر ایک لفظ نہیں کہا! آہ! اگر وہ ہم میں سے ہر ایک پر گالیوں کی بوچھار کر دیتا تو ہم لوگوں کا دل کس قدر ہلکا ہو جاتا!

اس کی خاموشی، جھکا ہوا سا تنا چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی دہشت اور صدمے کی گہری پرچھائیاں مجھ کو جو اس قدر گھبراہٹ اور کوفت ہوئی کہ تجزیہ جس کا بیان نہیں۔ کنکھیوں سے بار بار میں اپنے ساتھیوں کے چہروں کی طرف دیکھتا جو شرم سے سرخ ہو رہے تھے — مجھے خود بھی محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اپنے استاد کے خلاف جرم کیا ہے — ان کو دیکھ دیکھ کر مجھے بہت ہی تکلیف ہو رہی تھی حالانکہ واڈکا خریدنے کا خیال برا نہیں تھا —

ان بیٹھکوں سے میری طبیعت اکتا جاتی تھی — جی چاہتا کہ باہر نکل کر تاتاری محلے میں گھوموں — یہاں کے لوگوں کی اپنی ایک الگ زندگی تھی، صاف ستھری اور عجیب و غریب سی زندگی — یہاں کے رہنے والے بااخلاق بھی تھے، بامذاق بھی، اور ایک اجنبی سی ٹوٹی پھوٹی زبان بولتے تھے جو روسی ہی تھی — جب شام ہونے لگتی تو مؤذن کی حیرت انگیز صدا، اونچے اونچے گنبدوں سے گونجتی ہوئی ان کو نمازوں کے لئے پکارتی — تاتاریوں کی پوری زندگی کا نقشہ ہی میرے نزدیک بالکل مختلف تھا — جس زندگی کو میں جانتا تھا اور جس سے میں مطمئن نہ تھا اور نہ خوش اس سے ان کی زندگی کی کوئی مطابقت نہ تھی —

والگا کی کشش بھی مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی، خاص طور پر محنت کی وہ موسیقی جو ہر وقت والگا پر گونجتی رہتی تھی — آج تک بھی اس موسیقی کی یاد کے نشے سے دل کو سرور حاصل ہوتا ہے اور مجھے وہ گھڑیاں یاد آتی ہیں جب میں نے پہلی بار محنت کی دلیرانہ موسیقی کے سحر کو جانا تھا اور اس کا مزا چکھا تھا!

قزان سے ذرا نیچے کو ہٹ کر ایک بڑا سا بجرا جس میں ایرانی برتن اور اور سامان لدا ہوا تھا ایک چٹان پر چڑھ گیا تھا اور اس کے پیندے کو نقصان پہنچ گیا تھا — قلیوں کے ایک گروہ،

نے سامان اتارنے کا ٹھیکہ لیا تھا اور اس گروہ میں میں بھی تھا۔ ستمبر کا مہینہ تھا، دریا میں اتری تیز سرد ہوا چل رہی تھی جو بارش کی بوندوں سے دوڑائے لئے جاتی تھی۔ بورے سرمئی دریا پر لہریں سر اٹھا اٹھا کر اچھلتی جاتی تھیں اور تیز ہوا کے جھونکے ان کی کلغیوں کو زنائے کے ساتھ نوچتے جاتے۔ ہمارا گروہ جس میں کوئی پچاس آدمی رہے ہوں گے، ایک خالی بجرے کے عرشے پر سوار تھا۔ ترپالوں اور بوروں سے ہم لوگ اپنے آپ کو ڈھکے ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے سٹ کر گٹھری نے بیٹھے تھے۔ ایک چھوٹا سا اسٹیمر بجرے کو کھینچ رہا تھا اور برسے پانی میں شراروں کی لہریں چھوڑتا جاتا تھا۔

شام ہوئی۔ سیسے کے رنگ کا آسمان اندھیرے کے ساتھ ساتھ جھول کھاتا گیا اور دریا پر نیچے کی طرف سمٹتا گیا۔ قلیوں نے بڑبڑانا اور گالیاں بکنا شروع کیا۔۔۔ بارش کو گالی دی، ہوا کو گالی دی، زندگی کو گالی دی۔۔۔ عرشے پر ادھر سے ادھر آہستہ آہستہ کھسکنے کہ بارش سے، نمی سے، سردی سے کہیں پناہ مل جائے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سوئے ہوئے لوگ جو کام کرنے اٹھے تھے، اس کے لئے بالکل نا اہل تھے۔ یہ لوگ کیا اس ڈوبے ہوئے مال کو بچا سکتے تھے؟ کبھی نہیں!

آدھی رات کے قریب ہم چھچھلے پانی میں پہنچ گئے اور تیزی سے اس ٹوٹے ہوئے بجرے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ہمارے گروہ کا لیڈر ایک زہریلے مزاج کا بوڑھا تھا جس کے چہرے پر ماتا کے داغ تھے، بے حد چالاک، بدزبان، آنکھیں اور ناک چیل کی سی۔ اس نے اپنی گنجی کھوپڑی سے ٹوپی اتاری اور زور سے عورتوں کی سی آواز میں چیخا:

''لڑکو دعا مانگو! دعا مانگو نوجوانو!،،

سب ہی عرشے پر ایک گچھے کی طرح اکٹھے ہو گئے۔ اندھیری رات میں وہ ایک سیاہ گٹھڑی کی طرح لگتے تھے اور پھر ریچھوں کی طرح انہوں نے آہستہ آہستہ غر غر کرنی شروع کی۔ لیڈر نے سب سے پہلے دعا ختم کی اور پھر آواز دی:

”لالٹینیں لاؤ، جوانو! اب دکھا دو کہ تم کیا کر سکتے ہو! ہاں، بچو، اصلیت دکھا دینا! پروردگار ساتھ ہے —— بڑھو!“

اور پھر یہ سست، آہستہ آہستہ چلنے والے، بارش سے بھیگے ہوئے انسان واقعی دکھانے لگے کہ وہ کیا کر سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے جنگ ہے، معرکہ ہے، حملہ ہو رہا ہے رن پڑ رہا ہے۔ شور مچاتے، چیختے چلاتے، ہنسی مذاق کرتے سب کے سب اس ڈوبتے ہوئے بجرے کے عرشے پر ٹوٹ پڑے! چاول کی بوریاں، کشمش کی ٹوکریاں، کھالیں اس طرح میرے چاروں طرف ہوا میں اڑنے لگیں جیسے پر اڑ رہے ہوں۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی ڈھیلے ڈھالے پست طبیعت لوگ ہیں جو ابھی ریں ریں ریں ریں کرکے بارش اور سردی اور زندگی کو کوس رہے تھے اور اب اس خوش دلی اور آسانی اور اس کمال کے ساتھ اتنی محنت کا مظاہرہ کر رہے ہیں! بارش تیز تر ہوتی گئی اور اس کی خنکی بڑھتی گئی۔ ہوا میں تیزی آتی گئی اور وہ ہماری قمیصوں میں بھر بھر کر ان کو پھلا دیتی اور کھینچتی اور ہمارے سروں پر الٹ الٹ دیتی جس سے پیٹ اور سینہ کھل جاتے۔ اندھیرے میں، پانی اور کیچڑ میں صرف چھ چندھی لالٹینوں کی اندھی روشنی میں یہ سیاہ خاکے ادھر سے ادھر بجروں کے عرشوں پر بھدا بھد دوڑتے پھر رہے تھے۔ ننگے پیروں کی تھپ تھپ سنائی دے رہی تھی اور وہ اس طرح کام کر رہے تھے جیسے انہیں محنت کی ہوس لگی ہو، جیسے انہیں چار چار پنسیریوں کی بوریوں کو اچھالنے کا اشتیاق، انتظار اور تڑپ مدت سے رہی ہو۔ سامان کی گانٹھیں کندھے پر رکھ کر

دوڑ لگانے کے وہ منتظر اور مشتاق رہے ہوں۔ وہ اس طرح کام کر رہے تھے جیسے کسی دلچسپ کھیل میں جٹے ہوں۔ بچوں کے سے شوق کے ساتھ، محنت کے نشے اور سرور میں مست —— ایسا نشہ جس سے لطیف تر صرف عورت کی آغوش ہی ہوتی ہو!

ایک بڑا سا داڑھی والا آدمی بھیگا ہوا، پھسلتا ہوا، لمبا سا کوٹ پہنے جو غالباً اس سامان کا مالک تھا یا شاید ایجنٹ رہا ہو اپنی آواز کی پوری طاقت سے چلا رہا تھا:

''اے ساتھیو —— ایک بالٹی تمہارے لئے! اے سمندری ڈاکوؤ —— دو بالٹی تمہارے لئے! کام ختم کردو تو بات ہے!''

اندھیرے سے آوازیں اس کی طرف آئیں:

''نہیں، نہیں، تین بالٹی کر دیجئے!''

''اچھا چلو، تین ہی بالٹی سہی! کام پورا کرو!''

اور محنت کے طوفان میں اور شدت آگئی۔

میں نے بھی بوریاں جھپٹیں، گھسیٹیں، پھینکیں —— پھر جھپٹیں! مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں خود اور میرے چاروں طرف ہر چیز ایک جنگلی اور جوشیلے ناچ میں شامل ہوگئی ہے اور یہ لوگ مہینوں تک بغیر تھکے، بغیر رکے اس دلچسپ اور جان توڑ کام کو جاری رکھ سکتے ہیں، بلکہ برسوں تک — بلکہ یوں کہئے کہ یہ لوگ تو یہ اہلیت رکھتے ہیں کہ اگر یہ میناروں اور گنبدوں کو ہاتھ لگا دیں تو پورے شہر کو اپنی جگہ سے اٹھا کر جہاں چاہیں لیجائیں۔

اس رات میں نے ایک ایسا مزہ چکھا جس کا تجربہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور میرے دل میں اس ارمان کے شعلے بھڑک رہے تھے کہ ساری زندگی محنت کی اسی نیم مجنونانہ کیفیت میں گذرے! نیچے لہریں رقص کر رہی تھیں۔ بارش اب بھی عرشے کو دھو رہی تھی، ہوا دریا کی سطح پر سے بھنبھناتی ہوئی گذر رہی تھی — اور علی الصباح، پو پھٹنے کے سرمئی رنگ میں یہ پانی میں بھیگے

ہوئے نیم برہنہ لوگ اسی دوڑ لگائے ہوئے ہیں —— [illegible] اور ان لوگ دوڑ —— ہنستے جاتے، چیختے جاتے اور اپنی محنت اور لوٹ کی عظمت کا سکہ بٹھاتے جاتے! اور پھر ہوا نے بادلوں کے گہرے نقاب کو چیر دیا — سورج کی ایک سنہری کرن آسمان کی چمکتی ہوئی نیلاہٹ کے پار ہوئی — ان زندہ دل وحشیوں نے ایک چیخ کے ساتھ اس کرن کو خوش آمدید کہی —— ہنستے ہوئے ہونٹ آسمان کی طرف اٹھ گئے جو بھیگی ہوئی داڑھیوں اور زلفوں کے ہالے میں ابھرے ہوئے تھے — میرا دل چاہتا کہ دوڑ کر ان سب کو بیک وقت گلے سے لگا لوں —— یہ دو پائے جانور جو اپنے عمل اور کام میں یکتا ہیں، جو اپنی محنت میں اس قدر کھو گئے تھے —

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ مسرت بھری جوشیلی طاقت بے کنار تھی — اس کے آگے کیا چیز ٹھہر سکتی تھی — یہ طاقت دنیا میں معجزے دکھا سکتی تھی، رات بھر میں زمین پر حیرت انگیز شہر اور قلعے کھڑے کرسکتی تھی، جیسا کہ پریوں کے قصے کہانیوں میں بیان کیا گیا ہے — سورج کی کرن نے ایک دو منٹ انسان کی محنت پر نظر ڈالی، پھر بادلوں کے زبردست ڈھیر کا مقابلہ نہ کر سکی اور ان ہی کی گہرائیوں میں اس طرح ڈوب گئی جیسے سمندر میں کوئی بچہ ڈوب جائے — پانی موسلادھار برسنے لگا!

کسی نے چیخ کر کہا ''بس کرو!،، لیکن اس کو ایک وحشیانہ غصے سے بھرا ہوا جواب ملا:

''یہ کس نے کہا بس کرو؟،،

اور دن کے دو بجے تک یہ لوگ بغیر رکے ہوئے کام کرتے رہے —— برستے پانی اور چیختی ہوئی ہوا میں نیم برہنہ —— یہاں تک کہ آخری سامان بھی ادھر سے ادھر پہنچا دیا گیا — اور مجھے اس قوت، اس عظیم قوت کا ایک مقدس احساس ہوا جس سے ہماری یہ دنیا مالامال ہے!

دہ ختم ہو گیا تو پھر ہم انجن والے بجرے پر بیٹھے اور وہاں پڑ کر اس طرح سوئے جیسے سب کو شراب کا نشہ چڑھا ہو ۔ جب قازان پہنچے تو ریتلے ساحل پر ہم سب یوں اترے جیسے ایک بھورا گدلا چشمہ انڈیلا جا رہا ہو، اور سیدھے شراب خانے پہنچے ــــ بین بانٹی واد کا پینے!

وہ چوٹا باشکن وہاں آ پہونچا، مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور بولا:

''ان لوگوں نے تمہاری کیا گت بنادی ہے؟،،

میں بڑے جوش میں آ کر اس کو کام کے متعلق بتانے لگا ۔ اس نے سنا، ٹھنڈی سانس بھری، پھر حقارت سے بولا:

''احمق ۔ احمق سے بدتر ــــ گدھا!،،

سیٹی میں کوئی لے بجاتا ہوا وہ پاس پاس رکھی ہوئی میزوں کی قطار کے قریب سے گذرا جس پر قلی لوگ بیٹھے زور و شور سے دعوت اڑا رہے تھے ۔ ایک اونچی آواز نے کسی کونے سے ایک فحش گیت شروع کیا:

اہا، بات ہے اندھیری رات کی، آدھی رات کی
جب نکلی رانی سیر کو باغ میں!

بہت سی آوازیں اس طرح چیخنے لگیں کہ کان کے پردے پھٹ گئے ۔ میزوں پر لوگوں نے ہتھیلیوں سے تال دینی شروع کی:

دیکھا رات کے پہریدار نے
رانی لیٹی ہوئی ہے...

زور زور سے لوگ سیٹیاں بجا بجا کے، ہائے وائے، فوں فاں کرنے لگے، ایسے ایسے مزہ دار فقرے اور چوٹیلے طنز سنائی دینے لگے کہ دیواریں ہل گئیں ۔ یہ مزےدار چوٹیں، یہ پرخلوص مذاق دنیا میں اور کہاں؟

کسی نے میرا تعارف اندرئی دیرینکوف سے کروایا — اس کی چھوٹی سی پرچون کی دوکان تھی جو ایک تنگ سی غربت زدہ گلی کے نکڑ پر تھی — پاس ہی ایک کوڑے کرکٹ سے بھرا ہوا نالا تھا —

دیرینکوف کا قد چھوٹا تھا، ایک بازو سوکھا ہوا تھا، شفیق چہرہ، سنہری داڑھی سے گھرا ہوا، ذہین آنکھیں — اس کے پاس ممنوع کمیاب کتابوں کی ایک نادر لائبریری تھی جو قازان بھر میں مشہور تھی، اور شہر کے مختلف تعلیمی اداروں کے طالب علم اور انقلابی لوگ اس لائبریری سے برابر فائدہ اٹھاتے تھے —

پرچون کی یہ دوکان ایک نیچے سے چھپر میں تھی جو ایک اسکوپیتس* سود خور کے مکان کا ایک حصہ تھا — دوکان میں سے اندر کی طرف ایک بڑے کمرے میں دروازہ کھلتا تھا اور اس کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلتی تھی جو احاطے کی طرف تھی — اس کھڑکی سے مدھم روشنی کمرے میں آیا کرتی تھی — اسی کمرے سے ملا ہوا ایک تنگ سا باورچی خانہ تھا اور باورچی خانے کے پیچھے بڑے مکان اور چھپر کے درمیان والے اندھیرے گلیارے میں ایک چھوٹا سا گودام تھا — اسی گودام میں وہ غیر قانونی لائبریری تھی — بعض بعض کتابیں بیاضوں کی صورت میں ہاتھ سے لکھی ہوئی تھیں، مثلاً لاوروف کی کتاب ''تاریخی خطوط،،، چرنی شیفسکی کی کتاب ''کیا کیا جائے،،، پیسارف کے بہت سے مضامین کے مجموعے مثلاً ''شاہ بھوک،، اور ''الجھے ہوئے اعمال،، — یہ تمام مخطوطات مڑے تڑے اور گھسے ہوئے تھے جیسے لوگوں نے ان کو بڑی شدت سے پڑھ کر چھوڑ دیا ہو —

---

* روس میں ایک خاص مذہبی فرقہ ہوا کرتا تھا جو لوگوں کو آختہ کیا کرتا تھا — یہ لوگ 'اسکوپتسی' کہلاتے تھے —
(مترجم)

جب میں اس دوکان میں پہلی بار آیا تو دیریشکوف اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ اس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کردیا۔ میں اس بڑے سے نیم تاریک کمرے میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کونے میں جہاں صلیبی تصویر لگی ہوئی تھی، ایک بڑے میاں دوزانو بیٹھے دعا مانگ رہے ہیں۔ میں انہیں کھڑا دیکھتا رہا اور مجھے خیال ہوا کہ کچھ معاملہ گڑبڑ ہے۔ یہ تضاد کیسا؟

مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ دیریشکوف "ناروڈنک،، تھا۔ ناروڈنک ہونے کے معنی میرے نزدیک انقلابی ہونے کے تھے اور انقلابی کو خدا کی ذات پر یقین نہ رکھنا چاہئے تھا۔ لیکن یہ دل سے دعا مانگتا ہوا بڈھا اس گھر میں بہت ہی بے محل لگ رہا تھا۔

جب اس نے اپنی دعا ختم کرلی تو اپنے بالوں اور داڑھی پر ہاتھ پھیرا، پھر مجھے گھور کر دیکھا:

"میں اندرئی کا باپ ہوں۔ اور تم کون ہو؟ اچھا تو یہ بات ہے۔ میں سمجھا کوئی طالب علم بھیس بدل کر آ گیا۔،،

"لیکن طالب علم بھیس کیوں بدلے گا؟،، میں نے پوچھا۔

"خیر، ایسا ہی ہوتا ہے،، بوڑھے نے آہستگی سے جواب دیا۔ "آخر انسان چاہے جتنا بھیس بدل لے خدا تو جان ہی جاتا ہے۔،،

یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں گھس گیا۔ میں کھڑکی پر بیٹھ گیا اور خیالات میں کھو گیا۔ پھر یکایک میں نے کسی کو کہتے سنا:

"اچھا تو یہ اس قسم کا آدمی ہے!،،

ایک لڑکی سر سے پاؤں تک سفید کپڑے پہنے، باورچی خانے کے در سے لگی کھڑی تھی۔ اس کے سنہرے بال چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے تھے اور بھولا چہرہ پیلا تھا، گہری نیلی آنکھوں میں

مسکراہٹ چمک رہی تھی — وہ فرشتے کی طرح لگ رہی تھی — جس طرح فرشتے مسیحی قسم کی تصویروں میں نظر آتے ہیں —

’’تم کس بات سے ڈر رہے ہو؟ کیا میں اتنی بھیانک لگتی ہوں کہ تم خوف کھاؤ،‘‘ اس نے پوچھا — اس کی آواز باریک تھی اور تھرتھرا رہی تھی — آہستہ آہستہ، بڑی احتیاط سے چلتی ہوئی، دیوار سے لگی لگی وہ میری طرف بڑھنے لگی جیسے اس کے پیروں سے مضبوط فرش نہ ہو بلکہ ایک رسی ہو جو خلا میں تنی ہوئی ہو — اور چونکہ وہ تیز نہیں چل پا رہی تھی اس لئے اور بھی ایسا معلوم ہونے لگا گویا وہ کسی اور دنیا سے آئی ہے۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا جیسے اس کے تلووں میں سوئیاں چبھوئی جا رہی ہوں، جیسے دیوار اس کے گلگوتھنے، بچوں کے سے ہاتھوں کو ڈنک مار رہی ہو — انگلیاں ایک عجیب طرح سے اکڑی ہوئی تھیں اور بالکل حرکت نہیں کر رہی تھیں —

میں گونگوں کی طرح اس کے سامنے کھڑا تھا — سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کیا کہوں — البتہ ترس اس پر بہت آ رہا تھا۔ اس اندھیرے کمرے کی ہر چیز کس قدر غیرمعمولی تھی!

لڑکی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اس احتیاط سے کہ معلوم ہوتا تھا کرسی کے کہیں نکل بھاگنے کا خطرہ ہے۔ اس نے بڑی سادگی سے مجھے بتایا کہ ابھی چار پانچ ہی دن سے اس نے چلنا شروع کیا ہے ورنہ تین مہینے سے وہ بستر پر پڑی تھی — اس کے اعضا مفلوج ہو گئے تھے — جس سادگی سے اس نے یہ بات کہی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی —

’’یہ ایک قسم کی اعصابی بیماری ہے،‘‘ وہ مسکراتی ہوئی بولی —

مجھے یاد ہے کہ اس وقت میرا دل چاہا تھا کہ کاش اس کی حالت کا کچھ اور سبب ہوتا تو بہتر تھا — اعصابی بیماری تو

اس لڑکی کے سلسلے میں معصومیت ھی روکیا مہمل لفظ ہے اور وہ بھی اس کمرے کے ماحول میں، جہاں ہر چیز جیسے شرما کر دیوار سے چپکی جا رہی ہو۔ صلیبی تصویر والے کونے میں لیمپ جل رہا تھا، اس کی تانبے کی زنجیروں کا عکس بڑی سی کھانے کی میز کی سفید چادر پر پڑ رہا تھا اور یوں ہی بلا وجہ ہل رہا تھا۔

اس لڑکی کی آواز جاری رہی، بچوں کی سی باریک آواز ''میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا اور میں جاننا چاہتی تھی کہ آپ ہیں کیسے؟،،

مجھ کو کوفت ہونے لگی۔ لڑکی جس طرح سے مجھے غور سے دیکھ رہی تھی اس سے مجھے اتنی پریشانی ہو رہی تھی کہ برداشت سے باہر تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی گہری نیلی آنکھوں کے پیچھے کوئی قوت ہے جو میرے سارے وجود کا، اندر تک، معائنہ اور مطالعہ کر رہی ہے۔ ایسی لڑکی سے بھلا میں کیا بات کرتا؟ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ میں خاموش کھڑا دیوار پر لگی تصویروں کو دیکھتا رہا —— ہرسن، دارون، ڈربلدی۔

ایک لڑکا جس کی عمر میرے ہی برابر ہوگی، سنہرے رنگ کے بال، گستاخ آنکھیں، تیزی سے دوزن کی طرف سے آیا اور باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے ہمارے پاس سے گذرا اور لڑکوں کی طرح آواز بدل کر بولا:

''ماریا، تم یہاں کیا کر رہی ہو؟،،

''یہ میرا سب سے چھوٹا بھائی الکسئی ہے۔ آپ کو پتہ ہے میں پڑھ رہی تھی، نرس (دائی) بننے کی ٹریننگ لے رہی تھی۔ لیکن میں بیمار پڑ گئی۔ آپ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ کیا شرماتے ہیں آپ؟،،

اتنے میں اندرئی دیریبنکوف اندر آگیا۔ اپنا سوکھا ہاتھ صدری کی بغل میں دئے، اس نے اپنی بہن کے ریشمی بالوں پر ہاتھ

پھیرا، ذرا سا ان کو الجھایا اور پھر مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں کس قسم کے دم کی تلاش میں ہوں۔

پھر ایک دبلی پتلی لڑکی جس کے بال شعلوں کی طرح سرخ تھے اور آنکھیں سبز، اندر آگئی اور ذرا بگڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس نے سفید لباس والی لڑکی کا بازو پکڑا اور اسے لے گئی۔

''چلو ماریا، بس بہت ہوا۔،،

ماریا نام دراصل اس لڑکی کے لئے بالکل نامناسب تھا، بہت ہی کھردرا تھا اس کے لئے۔

میں ایک عجیب سا اشتیاق دل میں لئے واپس ہوا۔ دو دن بعد کرینہ پھر مجھ کو اس کمرے میں لے گئی۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہاں جو لوگ رہتے ہیں وہ کس قسم کی زندگی بسر کرتے تھے اور اس کے کیا معنی تھے۔ کیونکہ وہ ماحول بڑا ہی عجیب تھا۔

وہ خاکسار اور قابل محبت بڈھا اسپان ایوانووچ، جس کا سارا سر سفید ہو کر شفاف زردی کی طرف مائل تھا، کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا، آہستگی سے مسکرایا کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے سرمئی ہونٹ دھیرے سے ہلا کر کہہ رہا ہو:

''میرا پیچھا چھوڑ دو! مجھے تنہا چھوڑ دو!،،

یہ بات بھی مجھے صاف نظر آتی تھی کہ اس کو کسی مصیبت کے یکایک آپڑنے کا خطرہ ہر وقت محسوس ہوتا رہتا تھا اور اس پر خوف کی ایک مستقل کیفیت چھائی رہتی تھی۔

سوکھے ہاتھ والا اندرونی سرمئی جاکٹ پہنے، جو سامنے سے آگے اور بغل کے دھبوں سے چکٹ ہو کر سخت ہو گئی تھی، کمرے میں آڑا آڑا گھومتا رہتا ——— احتیاط کے ساتھ، رک رک کر، جیسے کوئی بچہ جس کی کسی بے ضرور سزا کو ابھی ابھی معاف کیا گیا ہو۔ دوکان میں الکسئی اس کی مدد کرتا تھا۔ وہ گنوار اور سست

تھا — تیسرا بھائی ایوان استادوں کے کالج میں طالب علم تھا، وہیں بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا اور صرف چھٹیوں میں گھر آتا تھا — ایوان صاف ستھرے کپڑے پہنتا تھا، قاعدے سے کنگھی کئے، چکنا مکنا بنا رہتا تھا جیسے کوئی بڑھاپے کی طرف مائل سرکاری کلرک — ماریا جو بیمار بہن تھی، وہ اوپر کی منزل میں دالان میں رہتی تھی اور شاذ ہی کبھی نیچے اترتی تھی — جب وہ نیچے اتر آتی تھی تو مجھے ہمیشہ بہت گھبراہٹ ہوتی تھی جیسے مجھے ان دیکھی زنجیروں نے جکڑ رکھا ہے —

دیرینکوف کے گھر کا انتظام ایک لمبی، دبلی پتلی سی عورت کیا کرتی تھی جس کا چہرہ کٹھ پتلی کا سا تھا اور آنکھوں میں دیوداسیوں جیسی تلخ سختی — یہ عورت مکان دار کے یہاں رہتی تھی — اس کی لڑکی ناستیا بھی جس کے سرخ بال اور تیکھی ناک تھی، اپنی ماں کو کام کاج میں مدد دیا کرتی تھی — جب ناستیا کسی مرد کی طرف اپنی سبز آنکھیں اٹھاتی تھی تو اس کے نتھنے پھڑکنے لگتے تھے

لیکن دیرینکوف کے گھر کے اصل مالک طالب علم لوگ تھے —— طالب علم جو یونیورسٹی سے، مذہبی اکاڈمی سے یا جانوروں کے انسٹیٹیوٹ سے جمع ہوا کرتے تھے — نوجوان طالب علموں کا یہ ہلڑ باز گروہ روسی عوام کے لئے دل میں درد رکھتا تھا اور روس کے مستقبل کے لئے بے قرار رہتا تھا — اخباروں کے مضامین، نئی پڑھی ہوئی کتابوں سے نکالے ہوئے نتیجوں اور شہر اور یونیورسٹی میں ہونے والے واقعات سے متاثر ہو کر وہ دیرینکوف کی دوکان کی طرف لپکتے — کسی بھی شام کو قازان کے تمام حصوں سے اکٹھے ہوتے اور وہاں جمع ہو جاتے —— یا تو زور زور کی بحثیں ہوتیں یا کمرے کے مختلف کونوں میں کھسر پھسر چلتی رہتی — وہ لوگ بڑی بڑی کتابیں لے کر آتے، بے حد جوش میں آ کر صفحوں پر انگلیاں مارتے، ایک دوسرے پر چیختے —— ہر ایک جس بات کو سب سے زیادہ ٹھیک سمجھتا اسی پر زور دیتا —

ظاہر ہے یہ بحثیں میری سمجھ میں کیا خاک آتیں۔ جس حقیقت پر بحث ہوتی وہ تو میرے واسطے الفاظ کے گورکھ دھندوں میں یوں غائب ہوجاتی اور ڈھونڈے سے نہ ملتی جیسے غریب کی پتلی دال میں چکنائی کی پھٹکیاں! ان میں بعض طالب علموں کو دیکھ کر مجھے داڑھی والے کٹر مذہبی لوگ یاد آجاتے جو والد کے علاقے میں رہتے تھے۔ لیکن کم از کم اب مجھے ایسے لوگ ضرور ملے تھے جن کا مقصد ہی زندگی کو بدلنا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ ان کا خلوص الفاظ کے تیز دھارے میں ہانپتا، ٹکراتا چلا جا رہا تھا پھر بھی وہ اس دھارے میں ڈوبتا نہیں تھا۔ مجھے صاف نظر آتا تھا کہ ان کو کون سے مسائل حل کرنے چاہئیں، ایسے مسائل جن کے کامیاب حل کی مجھے ذاتی خواہش، ذاتی دلچسپی تھی۔ مجھے اکثر ایسا معلوم ہوتا کہ طالب علموں کی یہ باتیں میرے اپنے ہی خاموش خیالات کا اظہار کر رہی ہیں۔ میں ان لوگوں کو تقریباً ان ہی جذبات کے ساتھ پوجتا تھا جیسے کوئی قیدی ان لوگوں کو جو اسے قید سے چھٹکارا دلانے کی امید دلائیں۔

وہ لوگ اپنی جگہ پر مجھے اس نظر سے دیکھتے تھے جیسے کوئی ماہر بڑھئی یا فرنیچر بنانے والا ایک لکڑی کے ٹکڑے کو دیکھتا ہے، جس سے کوئی ایسی چیز بن جانے کا امکان ہو جو بالکل معمولی ہی نہ ہو۔

میرا تعارف کرواتے وقت ایک طالب علم دوسرے سے کہتا ''یہ ہونہار اور انوکھی شخصیت ہے!،، اور اس کی آواز میں ایسا فخر ہوتا گویا گلی کا کوئی لونڈا اپنے کسی ساتھی کو تانبے کا ایک پیسہ دکھا رہا ہو جو اس نے بدرو میں پڑا پایا ہو۔ میں ''ہونہار،، کہلانا پسند نہیں کرتا تھا۔ نہ مجھے یہ اچھا لگتا تھا کہ کوئی مجھے ''عوام کا بیٹا،، کہے۔ میں تو یہ محسوس کرتا تھا کہ میں زندگی کا بیٹا تھا مگر سوتیلا۔ پھر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا

کہ جس طریقے سے کہ نئی طاقتیں میری ذہنی نشو و نما کی رہبری اور ہدایت کریں وہ طریقہ بھی مجھے ناگوار گذرا اور سخت کوفت ہوئی۔ اسی طرح ایک دن ایسا ہوا کہ میں نے ایک کتب کی دوکان کی کھڑکی پر ایک کتاب رکھی دیکھی جس کا نام تھا ''اموال و اصول،،۔ اگرچہ میں ان الفاظ کے معنی نہیں جانتا تھا پر مجھے سمجھنے کیوں ایک دم سے خواہش ہوئی کہ اسے پڑھوں۔ چنانچہ میں نے مذہبی اکادمی کے ایک طالب علم سے درخواست کی کہ وہ کتاب مجھے دے دیں۔

''اور کیا!،، اس ہونے والے آرک بشپ نے طنز سے جواب دیا۔ وہ نوجوان آدمی تھے، حبشیوں کا سا سر، چھوٹے چھوٹے گھونگھر پڑے ہوئے بال، موٹے ہونٹ اور چمکتے ہوئے سفید دانت۔ ''بھئی یہ سب بےوقوفی کی باتیں ہیں۔ تم کو جو دیا جاتا ہے وہ تم پڑھو اور جس بات سے تم سے مطلب نہیں ہے اس میں اپنی ٹانگ نہ اڑاؤ!،،

اپنے استاد کی یہ سخت کلامی مجھے ڈنک کی طرح چبھی۔ پھر بھی میں نے وہ کتاب خرید ہی لی۔ کچھ پیسے قلی گری کر کے کمائے، کچھ اندرئی دریشکوف سے ادھار لئے۔ اب تک وہ کتاب میرے پاس ہے اور وہ پہلی سنجیدہ کتاب ہے جو میں نے خریدی۔

عام طور پر مجھ سے برتاؤ بڑا سخت کیا جاتا تھا! جب میں نے ''سماجی علوم کی ابجد،، پڑھی تو میں نے محسوس کیا کہ مصنف نے تہذیب کی ترقی میں کھیتی باڑی کرنے والے قبیلوں کی جو اہمیت دکھائی تھی، اس میں مبالغے سے کام لیا تھا اور بلا وجہ گھومنے والے شکاری قبیلوں کی اہمیت گھٹائی تھی حالانکہ ان لوگوں میں بڑی اپج تھی۔ میں نے یہ خیال اپنے رہبروں میں سے ایک کے سامنے ظاہر کیا جو لسانیات کا طالب علم تھا۔ اور پھر ایک گھنٹے تک وہ اپنے عورتوں کے سے نازک ناک نقشے پر سختی طاری کئے مجھ کو لیکچر پلاتا رہا کہ ''تنقید کا حق،، کس کو کہتے ہیں۔

''تنقید کرنے کا حق حاصل کرنے کے واسطے انسان کو جاننے کہ وہ کسی مثبت سچائی پر ایمان رکھے، خود آپ کس سچائی، کس حقیقت کو مانتے ہیں؟'' اس نے مجھ سے پوچھا —

یہ طالب علم ہر وقت پڑھتا رہتا تھا، سڑک پر بھی! میں اکثر دیکھتا تھا کہ وہ سڑک پر چلا جا رہا ہے، چہرہ کتاب میں دفن ہے، ہر آنے جانے والے سے ٹکر ہو رہی ہے۔ جب اسے ٹائیفائڈ ہوا تو اپنی کوٹھری میں پڑا سرسامی حالت میں بھی وہ چلا رہا تھا ''اخلاقیات دراصل آزادی اور جبر کے عناصر کی ہم آہنگی کا نام ہے —— ہم آہنگی، ہم... آہن... گی.....

وہ نرم دل آدمی تھا، مسلسل غذا کی کمی کا مارا ہوا اور کمزور، مثبت سچائی کی مستقل تلاش سے گھسا ہوا۔ کتابوں کے سوا اس کی زندگی میں اور کوئی تفریح نہ تھی اور جب اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس نے دو بڑے ذہنوں کے تضاد میں ایک ہم آہنگی کا راستہ نکال لیا ہے تو اس کی نرم اور سیاہ آنکھیں بچوں کی سی مسکراہٹ سے جھلملانے لگتیں۔ قازان میں ہماری ملاقات کے تقریباً دس سال بعد میری ملاقات پھر اس سے خارکوف میں ہوئی، وہاں وہ اپنا یونیورسٹی کا کورس پورا کر رہا تھا اور کیم میں جلا وطنی کے پانچ سال کاٹ چکا تھا — اور مجھے ایسا لگا کہ وہ انسان مختلف نظریات کے بل میں پھنس گیا تھا جس میں چیونٹیاں ہی چیونٹیاں بھری پڑی تھیں — اسے تپ دق کا مہلک مرض تھا، خون تھوک رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ کارل مارکس اور نیتشے کے خیالات میں کسی جگہ ہم آہنگی نظر آجائے — اس نے اپنی پسیجی ہوئی ہتھیلیوں میں میرے دونوں ہاتھ پکڑے اور پھٹی ہوئی آواز میں کہا:

''زندگی بغیر امتزاج کے —— ناممکن!''

آخر اس کا انتقال ایک ٹرام میں ہوا جبکہ وہ یونیورسٹی جا رہا تھا —

زندگی کی منزل کے دوراہوں میں مجھے اس طرح کے بہت سے لوگ ملے ہیں۔ ان کی تعداد کافی ہے اور میرے نزدیک ان کی یاد ایک مقدس حیثیت رکھتی ہے۔

دیرینکوف کے یہاں ایسے بیسیوں ہی لوگ آتے جاتے تھے اور ان میں ایک جاپانی طالب علم بھی تھا۔ اس کا نام تھا پنٹیلیموں ساتو۔ وہ مذہبی اکادمی میں پڑھتا تھا۔ کبھی کبھار ان بیٹھکوں میں ایک بڑا سا چوڑے چکلے سینے والا آدمی بھی نظر آتا تھا جس کا سر تاتاریوں کی طرح منڈا ہوا تھا، بڑی سی لہرائی ہوئی داڑھی تھی۔ یہ آدمی اپنے بڑے سے چوڑے کوٹ کے اندر سلا ہوا لگتا تھا، کوٹ کے ہک ٹھوڑی تک بند رہتے تھے۔ عام طور پر وہ کسی کونے میں اکیلا بیٹھتا، چھوٹا سا پائپ پیتا رہتا اور اس کی آنکھیں کھوئی کھوئی، چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگوں کو غور سے دیکھتی رہتیں۔ اس کی یہ غور سے دیکھتی ہوئی گہری نظریں اکثر میرے چہرے پر جمی رہتیں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ مجھے اپنے خیال ہی خیال میں تول رہا ہے، اور مجھے اس سے نہ جانے کیوں ڈر سا لگتا۔ اس کی خاموشی مجھے معمہ سی محسوس ہوتی۔ باقی اور لوگ تو زور زور سے جلد جلد بات کرتے اور فیصلے دیتے جاتے اور ظاہر ہے کہ بات جیسی جتنی ہی جان دار ہوتی اتنی ہی مجھے اچھی لگتی۔ مگر مجھے یہ سمجھتے سمجھتے کافی عرصہ لگا کہ زوردار الفاظ اکثر بیشتر کس قدر گھٹیا اور پرفریب خیالات کی نقاب ہوتے ہیں! تو پھر اس داڑھی والے دیو کی خاموشی کے پردے میں کیا تھا؟

لوگ اس کو ''خوخول،، کہتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اندرئی کے سوا اور کسی کو اس کا اصل نام نہیں معلوم تھا۔ جلد ہی مجھے یہ پتہ چلا کہ یہ آدمی ابھی حال ہی میں یاقوتسک کے علاقے سے آیا تھا جہاں وہ دس سال سے جلاوطن تھا۔ اس بنا پر اس سے میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی لیکن اس سے ملنے جلنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مجھے

ہوئی مجھے ہچکچاہٹ محسوس نہ ہوئی بلکہ اس کے برخلاف دل میں ایک کرید سی پیدا ہوئی، ایک زبردست خواہش کہ مجھے ہر بات معلوم ہو جائے اور جتنی جلد ہو سکے، معلوم ہو جائے — دراصل مجھ میں یہ صفت ایسی تھی جس نے ساری زندگی مجھے کسی ایک چیز کا سنجیدہ مطالعہ نہیں کرنے دیا —

جب یہ لوگ عوام کے متعلق باتیں کرتے تھے تو میں حیران سنا کرتا تھا اور اپنے نکالے ہوئے نتائج پر بھروسہ کر پاتا تھا لیکن پھر بھی یہ ضرور محسوس ہوتا تھا کہ اس موضوع پر میں بالکل اسی طرح نہیں سوچتا تھا جس طرح وہ سوچتے تھے — ان کے خیال کے مطابق عوام مجسم عقلمندی، نیکی، خلوص اور حسن طبعیت کا نمونہ تھے، لیکن میں عوام کو اس نظریے سے اور اس روشنی میں نہیں دیکھتا تھا — اپنے چاروں طرف مجھے بڑھئی، قلی، مستری وغیرہ نظر آتے تھے — میں نے پلوف، اوسیپ اور گریگوری کو قریب سے دیکھا تھا — یہ لوگ عوام کو ایک اجتماعی حیثیت سے دیکھتے تھے اور یہ بحث مباحثہ کرنے والے اپنے آپ کو ان عوام سے کہیں نیچے سمجھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہمارا انحصار ان عوام کی مرضی پر تھا — مجھے یہ نظر آتا تھا کہ تمام حسن خیال اور ذہن کی طاقت ان مباحثہ کرنے والوں میں چھپی ہوئی ہے جو نئی طبیعتوں میں سوز و گداز کو جگہ دئے ہوئے تھے، جن میں زندہ رہنے اور زندگی کو بنانے کی ایک جولاں خواہش تھی، ایک آزادی ارمان تھا — وہ بنی نوع انسان کی محبت کے نئے اصولوں کو لے کر ایک آزاد زندگی کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے — یہ محبت، یہ لگن میں نے ان جیسے لوگوں میں کبھی نہیں دیکھی تھی جن کے ساتھ میں اب تک زندگی گذارتا چلا آیا تھا اور یہاں یہ لگن ہر لفظ سے گونجتی تھی، ہر نکتہ میں دمکتی تھی —

'عوام' کے ان پجاریوں کی یہ گفتگو میرے دل پر بارش کے

،، رگی بھر تصویروں کی طرح لگتی تھی اور میں دیہات کے تاریک حالات اور کسان کی شہیدوں جیسی زندگی کے متعلق لکھی ہوئی کتابیں بڑے شوق سے پڑھ رہا تھا۔ ان کتابوں سے مجھے بڑی مدد ملی اور میں یہ محسوس کرنے لگا کہ بنیِ نوعِ انسان سے شدت سے محبت کرکے ہی کسی کو یہ بات نصیب ہو سکتی ہے کہ وہ زندگی کی حقیقی اہمیت کو تلاش کرے اور اس کا عرفان حاصل کرے۔ میں نے اپنے متعلق سوچنا کم کر دیا دوسروں کی طرف اور زیادہ مائل ہو گیا۔

اندرئی دیرینکوف نے مجھ پر بھروسہ کرکے مجھے یہ بات بتائی کہ اس کی دوکان میں جو تھوڑی بہت آمدنی ہوتی تھی وہ دراصل ان ہی لوگوں کی مدد کے لئے وقف تھی —— یہ لوگ جو عوام کی خوشی کو ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے اور ترجیح دینے کے اصول کو مانتے تھے۔ جب وہ ان لوگوں میں گھرا ہوتا تو اس کے طور طریقے ایسے ہوتے جیسے کوئی معمولی مگر نہایت مخلص پادری ہو جو بڑے بشپ صاحب کا وعظ سن رہا ہو۔ ان پڑھے لکھوں کی سمجھداری سے وہ بے حد مرعوب رہتا تھا اور کبھی اس جذبے کو چھپانے کی بھی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اپنے خشک ہاتھ جیکٹ کے بغل میں دبائے، چہرے پر خوشی کی روشنی ناچتی ہوئی، وہ اپنی ریشمی داڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر مجھ سے پوچھتا جاتا:

''کیوں ہے نا زور دار بات، کیوں؟،،

اور اگر کبھی لاوروف جو جانوروں کا ڈاکٹر تھا، ان نارودنکوں کے خلاف بحث کرنے لگتا تو دیرینکوف آنکھیں جھکا کر آہستہ سے گھبرا کر کہتا:

''افوہ! یہ اس قدر گڑبڑ کرتا ہے!،،

اس لاوروف کی آواز بھی بڑی کرخت تھی، عجیب سی —— بولتا تو معلوم ہوتا بطخیں قیں قیں کر رہی ہیں۔

نارودنکوں کی طرف جو رویہ دیرینکوف کا تھا وہی میرا بھی تھا

بعد میں مجھے پتا لگا کہ دوسرے لوگ اس کے ساتھ جو برتاؤ کرتے تھے وہ مسخرے کا تھا۔ وہ اس کا لحاظ خیال ہی نہیں کرتے تھے جیسے مزدوروں کا برتاؤ نوکروں کے ساتھ ہوتا ہے یا شراب خانے کے بیروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ دیربنکوف کو خود اس بات کا احساس ہی نہیں تھا اکثر جب مہمان چلے جاتے تو وہ مجھے رات کو رہ جانے کے لئے کہتا۔ ہم لوگ کمرے کی سب چیزیں ٹھیک ٹھاک کرتے، پھر فرش پر نمدہ بچھاتے اور اس پر لیٹ کر رات گئے تک باتیں کیا کرتے۔ کونے میں جیسے سوئے ہوئے صنمی تصویر والے چراغ کی دھندلی روشنی سے کمرے کے کناروں پر پھیلی ہوئی تاریکی بس یوں ہی سی کم ہو جاتی تھی۔ مجھے ایمان کی جنتی مسرت کے ساتھ دیربنکوف مجھ سے آہستہ سے کہتا:

''وقت آنے دو۔ ابھی تو ایسے بہت سے اچھے انسان ہم لوگوں کے ساتھ ہو جائیں گے۔ ایسے ہزاروں! روس میں تمام جگہوں پر بھی لوگ ہوں گے اور پھر وہ تیزی سے ہماری زندگی کے ڈھانچے کو بدل دیں گے، اس کے پورے رنگ کو بدل دیں گے۔۔۔''

وہ عمر میں مجھ سے تقریباً دس سال بڑا تھا اور سرخ بالوں والی ناستیا کو بری طرح مرتا تھا۔ وہ لڑکی کی شریر آنکھوں سے آنکھیں ملاتے ڈرتا تھا اور دوسروں کے سامنے ناستیا سے اسی طرح خشک اور مالکانہ انداز سے بات کرتا جیسے مالک نوکر سے لیکن اس کی نظریں بڑے شوق سے ناستیا کا پیچھا کرتیں اور اکیلے میں تو باقاعدہ داڑھی کھینچتا جاتا اور گھبرا گھبرا کر لجاجت سے بات کرتا جاتا۔

اس کی چھوٹی بہن بھی کمرے کے کسی کونے سے الفاظ کی یہ کھینچا تانی دیکھتی اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں کھل جاتیں، بچوں کا سا منہ تمسخر کے سے انداز میں نیچے کو لٹک جاتا جیسے بہت غور سے کچھ سوچ رہی ہو۔ جب معمول سے زیادہ تیز الفاظ کا تبادلہ ہوتا تو وہ زور سے ایک گہری سانس کھینچتی جیسے یکا یک کسی نے اس

پر برف کا پانی پھینک دیا ہو۔ ایک سنہرے مائل بال والا نوجوان جو طب کا طالب علم تھا اس کے اردگرد مرغے کی طرح اکڑ کر گھومتا رہتا تھا۔ وہ اس سے پراسرار انداز میں دھیرے دھیرے باتیں کرتا اور اس وقت اس کی بھویں سکڑ جاتیں۔

یہ تمام باتیں مجھے غیر معمولی طور پر دلچسپ لگتی تھیں، لیکن خزاں کا موسم نزدیک آتا جارہا تھا اور لگے بندھے روزگار کے غیر زندگی بسر کرنا ناممکن تھا۔ میں اپنی ان نئی دلچسپیوں میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ رفتہ رفتہ کرکے میری کمائی کم ہوتی چلی گئی اور میں اپنی روز کی روٹی کے لئے دوسروں پر بھروسہ کرنے لگا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ دوسرے کی روٹی آسانی سے گلے نہیں اترتی۔ اب وقت آگیا تھا کہ میں جاڑے کے موسم کے لئے کسی ''جگہ،، کی تلاش کروں۔ مجھے نانبائی واسیلی سیمیونوف کے یہاں ''جگہ،، مل گئی۔

میں نے اپنی زندگی کے اس حصے کو اپنی مختصر کہانیوں ''مالک،، ''کونوالوف،، ''چھبیس اور ایک،، میں دکھایا ہے۔ بڑا سخت وقت تھا لیکن بڑا سبق آموز۔

میں جسمانی طور پر بہت ہی سخت مصیبت میں تھا اور ذہنی اور اخلاقی طور پر اس سے بھی زیادہ!

جب میں نے نانبائی کے یہاں نوکری کی تو میرے اور ان لوگوں کے درمیان جن کی صحبت اور رہبری اب میرے لئے ضروری بن گئی تھی، ایک دیوار سی کھڑی ہوگئی — ''بہلاوے کی دیوار،،! ان میں سے کوئی نانبائی کے یہاں مجھہ سے ملنے نہیں آتا تھا۔ مجھے چودہ گھنٹے روز کام کرنا ہوتا تھا اس لئے میں ہفتے والے دن بھی دیرینکوف کے یہاں نہیں جا سکتا تھا اور چھٹی کے دن اپنا وقت وہیں بیکری کے ساتھیوں کے ساتھہ یا سو کر گذارتا تھا۔ ان ساتھیوں میں سے کچھہ نے تو بہت جلد مجھہ کو ایک دلچسپ بیوقوف سمجھنا شروع کردی اور بعض مجھہ سے ایسی محبت کرنے لگے جیسی محبت بچے

اس شخص سے کرتے ہیں جو ان کو مزے دار کہانیاں سنائے۔ اب یہ تو شیطان ہی جانے کہ میں ان لوگوں سے کیا باتیں کیا کرتا تھا لیکن ہاں اپنے بھر تو ان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ ایک اور قسم کی زندگی کا بھی امکان ہے — ایک ایسی زندگی جو اتنی بوجھل نہ ہوگی، جس زندگی کا کوئی مقصد اور کوئی جواز ہوگا — کبھی کبھی تو میں اس میں کامیاب بھی ہوجاتا تھا — مجھے ان کے بھربھرائے ہوئے چہروں پر انسانی دکھ کی چمک یکایک دکھائی دے جاتی تھی — آنکھوں میں غصے اور نفرت کی چنگاریاں نظر آجاتی تھیں — مجھے اس سے خوشی ہوتی تھی — فخر محسوس ہوتا تھا کہ میں بھی ''عوام میں کام کر رہا ہوں''، ان کو ''روشنی پہنچا رہا ہوں'' —

لیکن فطری طور پر زیادہ تر میں ناکامیاب رہتا تھا۔ معلومات اور علم کی کمی کی وجہ سے میں بہت سے ایسے سوالات کا اطمینان بخش جواب نہیں دے پاتا تھا جو زندگی اور میرا ماحول سامنے لا کر کھڑے کردیتے تھے — پھر مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ میں ایک گندے چوبچہ میں پڑا ہوں جہاں بہت سے انسان اندھے کیڑوں کی طرح رینگتے اور ٹٹولتے پھرتے ہیں — جہاں لوگوں کی دراصل کوشش یہ رہتی ہے کہ کسی طرح حقیقت کو بھول جائیں اور اس بہلاوے کے لئے وہ شراب اور رنڈیوں کی آغوش کی طرف جھکتے تھے —

ہر مہینے جب تنخواہ بٹتی تو رنڈیوں کے یہاں جانا ایک ایسا قاعدہ تھا جو کبھی نہیں ٹوٹتا تھا — اس مسرت بخش دن کے آنے سے ایک ہفتہ پہلے سے لوگ اس خوشی کا خواب دیکھنے لگتے تھے اور وہ بھی باآواز بلند — جو خوشی حاصل ہوتی اس کے متعلق بعد میں تفصیل کے ساتھ ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات کیا جاتا — اس گفتگو میں وہ اپنی قوت مردانہ کے متعلق فحش طریقے سے فخر کرتے، بڑی بے دردی سے عورتوں کا مذاق اڑاتے اور ان کا ذکر کرتے وقت تھوکتے جاتے —

پر بھی عجیب عجیب بات یہ تھی کہ یہ سب ہو رہا تھا اس وقت تک مجھے شرم اور شکوہ کے ایک گہرے احساس کی آواز سی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان مقامات کے معنی، جہاں ایک روپے کے عوض رات بھر کے لئے ایک عورت کا جسم خریدا جا سکتا تھا، میرے ساتھی غصہ، شرم اور گھبراہٹ سی محسوس کرتے رہتے تھے اور یہ بات بالکل فطری بھی۔ بعض اتنا لرزتے تھے کہ مجھے فوراً یہ جی چاہتا تھا کہ ان کو رکھ لیں، جیسے مائیں رکھتی ہیں، حال پوچھنے کو آیا کرتی ہیں۔ ویسے مجھے جنسی معاملات سے بے حد دلچسپی بھی تھی میں ان چیزوں کو اور بھی گہری نظر سے دیکھتا تھا۔ اب تک مجھے عورت کی آغوش کا کوئی تجربہ نہ تھا اور میرا تجسس پھر مجھے عجیب مصیبت میں مبتلا کئے رکھتا تھا۔ عورتیں بھی اور میرے ساتھی بھی میرے لجیلے پن سے میرا مذاق اڑاتے تھے۔ جلد ہی میرے ساتھیوں نے ان ''آوارہ ڈھونڈوں'' میں مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دینا بھی چھوڑ دی۔ صاف صاف کہتے:

''بھائی، تم ہم لوگوں کے ساتھ نہ آؤ۔۔۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ تم ساتھ... آس پاس رہتے ہو تو... ذرا گڑبڑ رہتی ہے۔ ذرا... ویسا لگتا ہے۔''

میں یہ الفاظ اشتیاق سے سنتا اور یہ سمجھتا کہ وہ مجھے کوئی خاص اہمیت دے رہے ہیں۔ لیکن کوئی وجہ صاف وہ نہیں بتاتے۔

''ارے کیسا آدمی ہو تم بھی یار! ہم نے ایک دفعہ کہہ دیا، بس تو ہمارے ساتھ جب رہتے ہو تو ذرا دور ہو جاتا ہے معاملہ، اکتاہٹ سی ہونے لگتی ہے...''

صرف ارشد ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا۔

''ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بزرگ موجود ہو، جیسے باپ ساتھ ہو۔''

لڑکیوں نے پہلے تو میری پرہیزگاری کا مذاق اڑایا، پھر برا ماننے لگیں۔ ایک موٹی سی، ڈھلکی سی تولوس کی رہنے والی ''لوئیز''، یہی جس کا نام تھریسا بوروب تھا — اس کی عمر کوئی چالیس سال کی رہی ہوگی — ایک قحبہ خانے کی مالکہ تھی — اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کوئی اپنی نسل کا خوبصورت کتا دیکھ رہا ہو — پھر بولی:

''ارے لڑکیو، اس کو ہم لوگ نہیں سمجھ سکیں گے — یقیناً اس کی کوئی معشوقہ ہوگی — کیوں، ہے نا؟ ایسا مضبوط گبرو جوان! ضرور اس کی کوئی معشوقہ ہے جو اس کی لگام پکڑے ہوئے ہے ورنہ پھر کیا ہے!''

وہ شریر تھی۔ کبھی کبھی گھونٹ بھر شراب پی بھی لیتی اور جب شراب کے نشے میں ہوتی تو ایسی شرانگیز بکتی کہ کچھ کہنے کو نہیں — لیکن جب سنجیدہ ہوتی تو اس طرح لوگوں کے متعلق غوروفکر کرتی اور ان کے اعمال کو ایسی منطق سے پرکھتی کہ میں حیران رہ جاتا —

میرے ساتھیوں سے کہتی ''یہ جو اکادمی کے طالب علم ہیں ان کو سمجھنا سب سے زیادہ مشکل ہے، ہاں ایسا ہی ہے! یہ لوگ لڑکی کے ساتھ کیا کرتے ہیں: فرش پر صابن ملواتے ہیں اور پھر ایک بالکل ننگی لڑکی کو چاروں ہاتھ پاؤں پر چلاتے ہیں — اس کے ہاتھوں اور گھٹنوں کے نیچے چینی کی پلیٹیں رکھ کر اس کو پیچھے سے ایک دھکا دیتے ہیں کہ دیکھیں کتنی دور تک جاتی ہے — پھر اسی طرح ایک اور لڑکی کے ساتھ، پھر ایک اور لڑکی کے ساتھ — ہاں، بھلا بتاؤ، آخر کیوں؟ معلوم نہیں —''

میں غصے میں بھر کر چیخا ''یہ جھوٹ ہے! تم جھوٹ بولتی ہو!''

تھریسا نے بالکل برا نہیں مانا بلکہ سنجیدگی سے بولی ''نہیں،

بالکل جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔،، اس کی سنجیدگی میں رنج اور دکھ کی کھلاوٹ تھی۔

’’یہ سب تم نے خود گڑھا ہے!،،

’’لیکن کوئی بھی عورت ایسی بات کیسے گڑھ سکتی ہے یا تم سمجھتے ہو کہ میرا دماغ خراب ہے؟ میں پاگل ہوں؟،، اس نے آنکھیں پھاڑ کر غور سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگ ہماری اس بحث کو دلچسپی سے سن رہے تھے۔ تیریسا بات کرتی رہی اور ان لوگوں کے تھیلوں کا ذکر اس طرح کرتی رہی جیسے کوئی انسان تمام جذبات سے الگ ہو کر صرف ایک ہی بات کی تلاش میں ہو کہ اس کی سمجھ میں یہ آ جائے کہ ایسا کیوں ہے؟

سننے والے سن سن کر ہونکتے رہے اور طالب علموں پر لعنتوں کی بوچھار کرتے رہے۔ لیکن مجھے صرف یہ نظر آرہا تھا کہ تھریسا ان لوگوں کے حق میں کانٹے بو رہی ہے جن سے میں اس قدر محبت کرتا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ طالب علم تو عوام سے محبت کرتے تھے اور عوام کی بھلائی کے خواہاں تھے۔

’’وہ تو وہ طالب علم ہیں واسکریسینسکایا کی گلی والے جو معصوم لوگ ہیں اور یونیورسٹی کے۔ میں جن کا ذکر کر رہی ہوں وہ مذہبی اکیڈمی کے طالب علم ہیں، آرسکوئے کے میدان سے آئے ہیں۔ یہ سب دراصل یتیم ہیں۔ اور یہ یتیم بڑے ہو کر یقیناً چور اور بدمعاش بنتے ہیں۔ ان کا انتہائی گرا ہو جانا بالکل لازمی اور فطری ہے کیونکہ یہ لوگ لاوارث ٹھہرے، ان کی روک تھام کرنے والا ہے ہی کون؟،،

طالب علموں کے خلاف اس نائکہ کی ان ٹھنڈے دل سے سنائی ہوئی کہانیوں اور ان طالب علموں، سرکاری کلرکوں اور ان ’’سفید پوشوں،، کے خلاف رنڈیوں کی شکایتوں سے میرے ساتھیوں میں نفرت اور کراہت

کے علاوہ ایک اور احساس پیدا ہوا جو ان کو کسی قدر مسرت بھی بخشتا تھا اور جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے تھے:

''اچھا! تو پڑھے لکھے لوگ تو پھر ہم لوگوں سے بھی بدتر [illegible] ہوئے نا!''

میرے لئے ان باتوں کو سننا سخت کوفت اور تلخی کا باعث تھا — مجھے نظر آنے لگا تھا کہ کوڑے اور غلاظت کے ڈھیروں کی طرح ان تاریک کمروں میں بھی شہر بھر کی گندگی بہہ کر آئی تھی۔ بے ہودگی کی دھواں دیتی ہوئی آگ سر اٹھا کر بکتی تھی اور پھر دشمنی، غصہ اور کمینے پن کا یہ سب واپس ہوکر شہر میں پھیلتا تھا۔ ان سہمے ہوئے لوگوں کے اندر جہالت وحشیانہ جذبات اور زندگی کی سختیوں کے مارے ہوئے انسان پناہ لینے کی کوشش کرتے تھے۔ میں بے معنی باتوں کو محبت کے دکھ درد اور آرزوؤں کے بیان سے بھرے ہوئے گیتوں کے قالب میں ڈھلتے دیکھتا — ''تعلیم یافتہ'' لوگوں کی زندگیوں کے متعلق مکروہ افسانوں کو لوگوں کے دماغوں میں بیٹھتے دیکھتا — یہ دیکھتا کہ لوگ جو کچھ سمجھتے نہیں ہیں اس کی مخالفت کرتے ہیں اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں — اور مجھ پر یہ اچھی طرح واضح ہو گیا کہ یہ ''تفریح گاہیں'' ہی دراصل ایک یونیورسٹی تھیں جن میں میرے ساتھی علم حاصل کرتے تھے — ایک شدید قسم کا زہریلا اور مہلک علم!

میں ان بازاری عورتوں کو مستی کے ساتھ گندے فرش پر لوٹ لگاتے غور سے دیکھا کرتا تھا — ان کا تھل تھل، ہل ہلا، ڈھیلا جسم ایک نفرت انگیز طریقے پر تھرتھراتا اور پھڑکتا، ساتھ میں ایک اکارڈین کی زوردار چیخیں مسلسل جاری رہتیں یا کوئی ٹوٹا پھوٹا فرسودہ پیانو اس طرح ریں ریں ٹیں ٹیں کرتا کہ اعصاب کے پرخچے اڑنے لگتے — اور میرے دماغ میں کچھ عجیب عجیب، مبہم مبہم مگر پریشان کن خیالات چکر لگانے لگتے — اردگرد کی تمام چیزوں

سے بڑی اذیت ہوتی اور ہزار دل میں یہ خواہش ہونے لگی کہ کہیں نہ کہیں نکل بھاگوں۔

نوکری میں جب میں نے پہلی بار ان لوگوں کو دیکھا جو بڑے جوش وخروش سے خوابوں کی خوشحالی اور آزادی کی منزل تلاش کرنے میں مصروف تھے تو اکثر مجھے جواب ملتا کہ "اوہو، مگر یہ کر لیں تو ان کے بارے میں کچھ اور ہی سنائی دیں!"

بڑی بے رحمی سے میرا مذاق اڑایا جاتا، پکڑ پکڑ کر مجھ پر طنز کیا جاتا۔ ملازمت میں بھی ایک ہی سر درد بنا ہوا تھا! مجھے محسوس ہوا کہ میری بھی سمجھداری کچھ کم نہیں ہے اور میری ہمت ان بڑے لوگوں کی سمجھداری اور ہمت سے بہتر ہے — میں نے یہ دیکھا تھا کہ اگر زندگی گزارنا کوئی آسان بات نہیں تو زندگی کے متعلق سوچنا بھی کوئی معمولی بات نہیں — جن صاحب اور ان کے "لڈو سیٹھوں، کے ساتھ میں کام کرتا تھا، ان کو دیکھ کر کبھی کبھی مجھ پر نفرت کے شدید دورے پڑتے تھے — خاص طور سے جب میں یہ دیکھتا کہ ان میں برداشت کی صلاحیت کس قدر زندہ ہے اور کس طرح وہ مالک کے شرابی اور نیم مجنونانہ لہجے کی ہتک کو جھیل لیتے ہیں تو یہ بات میری برداشت سے باہر ہو جاتی۔

اور ایسا ہوا کہ آزمائش کے ان ہی دنوں میں ایک خیال میرے ذہن میں جاگزیں ہوا جو میرے لئے بالکل ہی نیا اور جدید تھا — ایک خیال جو بنیادی طور پر میری فطرت کے لئے تو بالکل ہی نیا اور انوکھا تھا لیکن جس سے مجھے گھبراہٹ بہت ہوئی۔

وہ ایک طوفانی رات تھی — ایک ایسی طوفانی رات جب یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہوا کے دشمنی بھرے زنّاٹوں سے آسمان بھی چکنا چور ہو گیا ہے، اس کے بے شمار ریزے ہو گئے ہیں اور اب وہ سموم بن کر چھن چھن کر گر رہا ہے کہ دنیا کو برف کے بڑے بڑے ڈھیروں تلے دبا دے — ایسی طوفانی رات جب لگتا ہے کہ دنیا ابھی زندگی

کے دن پورے کر چلی ہے اور سورج جیسے اس طرح چھپ گیا ہے کہ اب نہیں نکلے گا، کبھی نہ ابھرے گا ـــ میں نے برف کے تودوں کے بیچ سے سڑک کی طرف اپنے قدموں کو حرکت دی ـــ ہوا میرے منہ پر تھپیڑے مار رہی تھی اور میں آنکھیں بند کئے اس سنسان اور کھوئے ہوئے شہر میں سے گزرتا چلا جا رہا تھا۔ دفعتاً مجھے کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور میں دھڑام سے گرا۔ ایک آدمی لمبا لمبا پڑا ہوا تھا، برف میں دبا تھا اور میرے منہ سے جیسے الحمید نکلا تھا ـــ ہم دونوں نے ایک دوسرے پر لعنت بھیجی ـــ میں نے روسی زبان میں، اس نے فرانسیسی زبان میں۔

''ارے شیطان...'' اس نے فرانسیسی زبان میں کہا ـــ مجھے بڑا عجیب لگا۔ کھسک کر میں نے اس کو دیکھا ـــ چھوٹے قد کا آدمی، وزن بھی کچھ نہ تھا۔ اس نے میرا بازو جھنجھوڑا اور گڑگڑا کر بولا:

''ارے میری ہیٹ تو دے! دے میری ہیٹ! میں تو سردی سے جم کے مرجاؤں گا ـــ''

مجھے اس کی ہیٹ برف میں دبی ہوئی ملی، جھاڑ کر میں نے اس کی برف صاف کی اور اس آدمی کے برش جیسے سخت بالوں والے سر پر جما دی ـــ لیکن اس نے ہیٹ کو نوچ کر الگ کیا اور اسے لہرا لہرا کر، دونوں زبانوں میں گالیاں اور کوسنے دے دے کر مجھ پر بگڑنے لگا:

''نکل جا! دور ہو جا!''

پھر ایک دم تیر کی طرح آگے دوڑا اور طوفان کے اندھیرے میں کہیں غائب ہو گیا ـــ تھوڑی دیر بعد پھر میری اس سے مڈبھیڑ ہو گئی ـــ اب کی بار وہ سڑک کی ایک بجھی ہوئی لالٹین کے نیچے، اس کے کھمبے سے لپٹا ہوا بڑے جوش و خروش سے کچھ کہہ رہا تھا:

''لینا، میں مر رہا ہوں... لینا، آہ...''

ظاہر ہے کہ وہ نشے میں تھا ـــ اگر میں اس کو چھوڑ دیتا تو وہ یقیناً سردی سے اکڑ کر مر جاتا ـــ میں نے اس سے پوچھا کہاں رہتے ہو؟ اس نے آنسو بہاتے ہوئے جواب دیا:

''تو یہ کون سی سڑک ہے؛ ہائے مجھے کچھ پتہ نہیں کہ کدھر جاؤں —''

میں نے اسے اپنے بازو کا سہارا دیا اور ساتھ لے چلتے ہوئے نرمی سے اس کے گھر کا پتہ پوچھا — اس نے سردی سے کنکپاتے ہوئے، بدبدا کے کہا:

''ارے وہ بولاک — بولاک پر... وہاں جو حمام گھر ہے نا... وہ گھر ہے نا...''

اس کے پاؤں لڑکھڑاتے ہوئے پڑ رہے تھے، ٹھوکریں کھاتا، الٹے سیدھے قدم رکھتا وہ میرا چلنا بھی دوبھر کئے دے رہا تھا — میں اس کے دانتوں کی کٹکٹاہٹ سن رہا تھا —

وہ میری طرف لڑھکتا ہوا فرانسیسی زبان میں بولا ''کاش تمہیں پتہ ہوتا...''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے —''

وہ ٹھٹک گیا اور اپنا ہاتھ اٹھا کر صاف صاف لہجے میں — اور مجھے ایسا لگا کہ کسی قدر فخر کے ساتھ — فرانسیسی میں کہنے لگا:

''کاش تمہیں پتہ ہوتا میں جہاں تمہیں لے جا رہا ہوں...''

اس نے اپنی انگلیاں اپنے منھ میں ٹھونس لیں، لڑکھڑایا اور تقریباً گر پڑا — میں اکڑوں بیٹھ گیا اور اس کو اپنی پیٹھ پر لاد لیا — جب میں اسے لاد کے جا رہا تھا تو وہ اپنی ٹھوڑی کو میری کھوپڑی پر دبا کے پھر بڑبڑایا:

''کاش تمہیں معلوم ہوتا... لیکن میں تو ٹھٹھرا جا رہا ہوں! اے میرے خدا...''

جب ہم لوگ بولاک پر پہنچے تو مجھے بار بار اس سے پوچھنا پڑا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ آخرکار ہم لوگ ایک چھوٹی سی عمارت کے پھاٹک پر پہنچے جو ایک بڑے سے احاطے کے پچھلے حصے میں تھی اور اڑتے ہوئے برف کے زناٹوں کی آڑ میں چھپ گئی تھی — وہ آدمی ٹٹولتا ہوا اندرونی دروازے تک پہنچا اور آہستہ سے دستک دیتے ہوئے میری طرف مڑ کر کہا:

''بس بس، آہستہ.....''

ایک عورت نے خاموشی سے دروازہ کھولا — وہ سرخ ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے تھی — اس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی شمع سی بتی تھی۔ ایک طرف کو ذرا سا ہٹ کر اس نے ہم لوگوں کو اندر جانے کا راستہ دیا، پھر اپنے ڈریسنگ گاؤن کی کسی بڑی سی جیب میں سے ایک عینک نکالی اور اس کے ذریعہ غور سے میرا معائنہ شروع کردیا — میں نے اس عورت سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے اس آدمی کے ہاتھ جھلس گئے ہیں — اس کے کپڑے بدل کر اسے جلد بستر میں لٹانے کی ضرورت ہے —

''ہوں!.. '' اس نے گونجتی ہوئی جوان آواز میں پوچھا۔

''ہاتھوں کو ٹھنڈے پانی میں رکھنا چاہئے.....''

اس عورت نے اسی طرح حسبِ عادت اپنی عینک سے کمرے کے ایک کونے کی طرف اشارہ کردیا — لیکن اس کونے میں صرف لکڑی کا ایک ٹیک رکھا ہوا تھا اور ٹیک پر ایک شوربہ رکھی تھی جس میں ایک کدو بند ہوا تھا اور کچھ دکھائی — میں نے حیران ہو کر عورت کے چہرے کو قریب سے دیکھا —— چہرہ بڑے ہی عجیب طریقے پر سنجیدہ لگ رہا تھا — پھر وہ مجھ سے الگ ہٹ کر کمرے کے دوسرے کونے میں چلی گئی جہاں ایک لیمپ جل رہا تھا، جس پر گلابی شیڈ تھا — وہاں بیٹھے ہوئے اس نے میز پر سے ایک تاش کا لفافہ اٹھایا اور اسے غور سے دیکھنے لگی —

میں نے تقریباً چیخ کر کہا ''آپ کے پاس وادو ہولی سیوزی ہے؟'' اس عورت نے کوئی جواب نہیں دیا، نہایت انہماک کے ساتھ میز پر تاش کے پتے جماتی رہی — وہ آدمی کرسی پر اسی طرح بیٹھا رہا —— سر سینے پر جھکا ہوا تھا، سرخ ہاتھ بے جان سے ہو کر لٹک رہے تھے — میں نے اسے ایک کوچ پر لٹا دیا اور اس کے کپڑے اتارنے لگا — کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے —

ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے خواب دیکھ رہا ہوں۔ کوچ کے پاس والی دیوار فوٹوؤں سے اس قدر بھری تھی — قطار در قطار — کہ بالکل ڈھک گئی تھی اور ان قطاروں کے درمیان روشنی ایک سنہری ہار پر پڑ رہی تھی جس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا اور جو سفید فیتے سے بندھا ہوا لٹک رہا تھا۔ اس فیتے کے آخری سرے پر سنہری حروف سے چھپا ہوا تھا:

”بے مثال جیلدا کے واسطے،،۔

جب میں نے اس آدمی کے ہاتھوں کو ملنا شروع کیا تو وہ کراہنے لگا ''ارے ذرا احتیاط سے، ارے ذرا سنبھال کے! ارے کمبخت، لعنت ہے تجھ پر!،،

عورت اسی طرح کھوئی ہوئی، مکمل خاموشی کے ساتھ [illegible] جمائی رہی۔ نوکدار ناک کی وجہ سے اس کا چہرہ کچھ چڑیوں کا سا لگتا تھا۔ بڑی بڑی، ٹھہری ہوئی آنکھیں البتہ اس چہرے کو روشن کئے ہوئے تھیں۔ اب اس نے اپنے ہاتھ اٹھائے — لڑکیوں کے سے ہاتھ — اور بالوں میں انگلیاں ڈال کر انہیں اوپر کو اٹھا کر بکھرانے لگی۔ ویسے اس کے بال اس طرح بنے ہوئے تھے کہ ججوں کے عمامے کی طرح لگتے تھے۔ اس نے مدھم مگر بہت صاف آواز میں پوچھا:

''ژورژ، کیا میشا سے ملاقات ہوئی؟،،

ژورژ ایکدم اٹھ کے بیٹھ گیا اور مجھے ایک طرف کو دھکیل کر گھبرا کر جلدی سے جواب دیا:

''کیوں، مگر تم کو تو معلوم ہے کہ وہ کیئف گیا ہے....،،

''ہاں کیئف تو گیا ہے،، عورت نے اس کی بات دوہرائی، نگاہیں برابر تاش پر جمائے رکھیں — اس کی آواز میں کسی جذبے کا شائبہ تک نہ تھا۔

”وہ تو جلد واپس آجائے گا....،،

''ہاں؟،،

''ہاں ہاں، بہت جلد۔،،

''ہاں؟،، عورت نے پھر کہا۔

زورژ اسی طرح، نیم برہنہ، ادھڑے کپڑے پہنے ہوئے، صوفے سے اچھلا اور اس کے پاس پہنچ گیا اور اس نے سروں کے نزدیک دوزانو ہو کر فرانسیسی میں کچھ کہا۔ عورت نے روسی میں جواب دیا:

''میں بالکل نہیں گھبرا رہی ہوں۔ بالکل مطمئن ہوں۔،،

''بات یہ ہوئی کہ میں راستہ بھول گیا۔ اتنا سخت برفانی طوفان تھا، غضب کی ہوا تھی، میں تو سمجھا کہ جم کر مرجاؤں گا۔،،

پھر زورژ اس عورت کو جلدی جلدی سب حال بتانے لگا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے گھٹنے پر رکھے ہوئے بے جان سے ہاتھ کو سہلاتا رہا۔ اس آدمی کی عمر تقریباً چالیس سال رہی ہوگی، شہابی چہرے پر خوف و ہراس کی پرچھائیاں تھیں۔ سیاہ مونچھوں کے نیچے مڑے لبوں پر بھی خوف طاری تھا۔ گول کھوپڑی پر جو سفید بالوں کے سخت کھونٹھ اگے ہوئے تھے، ان پر وہ باربار ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کا نشہ تیزی سے اتر رہا تھا۔

عورت بولی ''ہم لوگ کل کیف جا رہے ہیں،، — لہجہ کچھ اس طرح کا تھا کہ یہ بات سوال بھی ہو سکتی تھی اور حکم بھی۔

''ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ کل جائیں گے۔ اب تمہیں آرام کرنا چاہئے۔ سوئیں کیوں نہیں؟ بہت دیر ہو گئی ہے نا...،،

''تو میشا آج نہیں آئے گا؟،،

''نہیں، نہیں۔ وہ آج کیسے آ سکتا ہے اتنا سخت تو طوفان ہے۔ آؤ، اب چلو سوؤ، تمہیں سونا چاہئے...،،

اس نے میز پر سے لیمپ اٹھایا اور عورت کو ایک چھوٹے سے دروازے سے لے چلا۔ اس دروازے کے آگے ایک کتاب کی الماری آڑ کئے ہوئے تھی۔ بڑی دیر تک میں اکیلا بیٹھا رہا۔ دماغ بالکل

خالی تھا۔ دوسرے کمرے سے اس آدمی کی پھنسی ہوئی آواز سنائی دیتی۔ کھڑکی پر طوفان اپنے بھیگے پنجے پھڑاپھڑ مار رہا تھا۔ فرش پر برف کے پگھل جانے سے ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا جس میں سے جلتی ہوئی شمع کی روشنی کا عکس آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ یہ کمرہ فرنیچر سے اٹا ہوا تھا۔ ایک عجیب قسم کی گرم خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی جو ذہن کو تھپک کر لوریاں دے رہی تھی اور اس پر نیند کی کیفیت طاری کر رہی تھی۔

خردار روپوش آیا، جھومتا ہوا، لیمپ ہاتھ میں لئے۔ شمع کا شعلہ ہل ہل کر چمنی کے شیشے سے لپٹ لپک رہا تھا۔

“وہ سو گئی۔”

لیمپ کو میز پر رکھ اور جیسے خیالات میں کھو گیا۔ پھر بیچ کمرے میں کھڑا ہو کر میری طرف دیکھے بغیر بولا:

“اچھا، تو پھر کیا کہا جائے۔ میں تو ختم ہی سمجھو! اگر تم نہ ہوتے تو... شکریہ... مگر یہ ہو گیا۔”

وہ ایک طرف کو گردن ٹیڑھی کئے کھڑا تھا جیسے بہت غور سے کوئی بات سن رہا ہو۔ دوسرے کمرے میں ذرا سی سرسراہٹ بھی ہوتی تو چونک کر اچھل پڑتا۔

میں نے بہت آہستہ سے پوچھا “یہ آپ کی بیوی تھیں...”

“ہاں میری بیوی ہے۔ میری سب کچھ ہے۔ جو کچھ بھی میرے لئے زندگی کے معنی ہیں وہ یہی ہے...” وہ آہستہ آہستہ مدھم لہجے میں فرش کو تکتا ہوا بولا اور پھر سر کھجانے لگا۔

“ہم لوگوں کو جانے کتنی چاہئے تھوڑی سی، کیوں...”

وہ اسی کھوئے ہوئے انداز میں دروازے کی طرف چلا۔ پھر اسے یاد آیا کہ نوکرانی بیمار تھی اور اسپتال بھیجی گئی ہے۔

میں نے سماوار گرم کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں اس نے حامی بھرتے ہوئے سر ہلایا اور ظاہر ہے کہ وہ یہ بالکل بھول

تھا نہ وہ پورے کمرے میں پھیلے ہوئے تھے کیونکہ وہ پہلے ہی پاؤں سے فرش پر ہوتا ہوا مجھے اپنے چھوٹے سے باورچی خانے میں لے گیا —— یہاں وہ تندور سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور پھر بولا:

”اگر تم نہ ہوتے تو میں ضرور جم جاتا ——۔۔“

پھر چونک کر خوفزدہ نظروں سے مجھے گھورنے لگا

”تو پھر اس بیچاری کا کیا ہوگا، کیا ہوتا ہے۔ اے پروردگار!۔۔“

جلدی جلدی پھسر پھسر بات کرتے وقت اس کی آنکھیں برابر اس تاریک سے کونے پر جمی ہوئی تھیں جس سے دروازے کا نشان معلوم ہوتا تھا ——

”ان کی طبیعت اچھی نہیں ہے —— تم نے دیکھا ہی تھا —— ان کے ایک بیٹا تھا۔ وہ موسیقار تھا ماسکو میں —— اس نے خودکشی کرلی۔ لیکن یہ اسی خیال میں ہیں کہ وہ گھر واپس آ رہا ہے حالانکہ اب اس بات کو دو سال کے قریب گذر چکے ہیں ۔۔“

بعد کو جب ہم لوگ چائے پینے بیٹھے تو وہ باتیں کرتا رہا، کچھ عجیب غیر مربوط باتیں، اور وہ بھی اس طرح کے الفاظ میں جو معمولی طور کی بات چیت میں کبھی نہیں سنائی دیتے —— اور اس نے بیان کیا کہ کس طرح وہ ایک زمیندار گھرانے کی لڑکی تھی، وہ خود تاریخ کا استاد تھا۔ کس طرح اس کو اس عورت کے لڑکے کے ٹیوٹر کی حیثیت سے رکھا گیا تھا، اسے عورت سے عشق ہو گیا —— اس کے واسطے اس عورت نے اپنے شوہر کو چھوڑا جو ایک جرمن نواب تھا —— پھر اس عورت نے کس طرح تھیٹروں میں گانا شروع کیا اور وہ دونوں کس قدر خوش تھے حالانکہ پہلے شوہر نے ان کی زندگی میں زہر انڈیلنے کی ہر ممکن کوشش کی اور ایڑی چوٹی کا زور لگایا ——

جس وقت وہ مجھے یہ سب بتا رہا تھا تو آنکھیں سکیڑے ہوئے باورچی خانے کی تاریک پرچھائیوں میں گھورے جا رہا تھا اور تندور کے قریب جہاں فرش کیا گیا تھا وہاں اس کی نظریں جمی ہوئی

تھیں۔ وہ اتنی گرم چائے پی رہا تھا کہ اس کا منھ جل جل جاتا اور چہرہ اس جلن کے اثر سے سکڑ جاتا تھا۔ پھر اس کی گول گول آنکھیں گھبراہٹ سے جھپکنے لگتیں

پھر پوچھنے لگا ”تو تم کون ہو؟ اچھا ہاں۔ بیکری میں کام کرتے ہو۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ تم تو نانبائی کے یہاں کام کرنے والے بالکل نہیں معلوم ہوتے۔ یہ ہو کیسے گیا؟ یہ معاملہ کیا ہے؟“

اس کی آواز میں کچھ خطرے کا احساس تھا۔ اور جس طرح سے اس نے مجھے دیکھا اس سے معلوم ہوتا تھا وہ مجھ پر بھروسہ نہیں کر رہا ہے، جیسے شکار جال میں پھنس گیا ہو۔

میں نے نہایت مختصر الفاظ میں اسے اپنی زندگی کے کچھ حالات سنائے۔ وہ آہستہ سے بولا:

”اچھا تو یہ بات ہے۔ ہوں... اب سمجھ میں آیا... تو یوں ہے بات!“

پھر یکایک جیسے اس میں جان سی پڑ گئی، پوچھنے لگا:

”وہ کہانی سنی ہے بلخ کے بدصورت بچے کی؟ میں سمجھتا ہوں تم تو وہ کہانی جانتے ہوگے!“

اس کے چہرے میں کچھ عجیب سی لرزش تھی۔ بولتے وقت الفاظ میں غصے کا جذبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی بھرائی ہوئی آواز بلند ہو کر کچھ اس طرح چیں چیں کر رہی تھی جو بالکل غیرفطری معلوم ہوتی تھی۔

”ایسی کہانیاں سن کر آدمی کو لالچ سی پیدا ہوتی ہے! جب میں تمہارے برابر تھا تو میں بھی اسی طرح کے خواب دیکھا کرتا تھا کہ شاید میں بھی راج ہنس بن جاؤں۔ خیر... اور... مجھے اکادمی میں پڑھنا چاہئے تھا لیکن اس کے بجائے میں یونیورسٹی میں چلا گیا۔ میرے والد پادری تھے — انہوں نے مجھے عاق کر دیا۔

پھر میں نے پیرس میں انسان کی بدبختیوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا —— یعنی ترقی کی تاریخ کا! لکھا بھی — اوہ، یہ سب اس قدر...،،

وہ چونکا، ایک پل کان لگا کر سنا، پھر کہنے لگا:

،،ترقی! یہ سب باتیں لوگوں نے خود فریبی کے لئے گڑھی ہیں — زندگی میں نہیں کوئی تک نہیں، نہ کوئی منطق ہے — غلامی کے بغیر ترقی کب ہو سکتی ہے! جیسے ہی اکثریت پر اقلیت کی حکومت ختم ہو جائے گی زندگی ٹھپ پڑ جائے گی — جب بھی ہم لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ زندگی آسان‌تر ہو جائے، محنت آسان‌تر ہو جائے تو ہم زندگی کو اور الجھا دیتے ہیں اور اپنے سر پر اور زیادہ محنت لاد لیتے ہیں — فیکٹریاں ہوں، مشینیں ہوں کس لئے؟ اور مشینیں بنانے کے لئے — یہ بھی کیا ہی حماقت کی بات ہے! دنیا میں فیکٹری کے مزدور بڑھتے ہی جاتے ہیں حالانکہ دنیا کو دراصل کسان کی زیادہ ضرورت ہے جو اناج پیدا کرے —— غذا! یہی ایک چیز ہے جو انسان کو اپنی محنت کے ذریعہ فطرت سے چھین لینی ہے — جتنا ہی انسان کم خواہش کریگا اتنا ہی زیادہ خوش رہیگا — زیادہ چاہےگا تو اس کی آزادی اتنی ہی کم ہوگی —،،

ممکن ہے الفاظ بالکل یہی نہ ہوں — لیکن اس کا مجھے یقین ہے کہ اس قسم کے زوردار اور پراثر خیالات سے یہ میرا پہلا سابقہ تھا — جب اس کی آواز چیں چیں کی کافی بلند سطح پر پہنچ گئی تو وہ ایک دم سے چپ ہو گیا اور دوسرے کمروں میں کھلنے والے دروازے کو غور سے دیکھتے ہوئے کان لگا کر سناٹے میں کچھ سننے لگا — پھر اس نے غصے میں بھری ہوئی پھسر پھسر شروع کی:

''یہ بات اچھی طرح اپنے دماغ میں گھسا لو کہ کسی کو زیادہ کی ضرورت نہیں ہے —— ایک روٹی ہو اور ایک عورت...،،

عورت کے متعلق بات کرتے وقت اس کی آواز نہائت مدھم اور پراسرار ہوگئی، ایسے الفاظ جو میں جانتا نہ تھا، ایسے اشعار جو میں

نے کبھی پڑھے تھے، نہ سنے تھے۔ ایک دم سے وہ بالکل باشکن کی طرح نظر آنے لگا، باشکن چوٹے کی طرح۔

اس نے کچھ نام آہستہ آہستہ لئے: سربجیے، قیامت، لاؤرا، نینوں۔ میں ان ناموں کو جانتا ہی نہ تھا۔ اس نے ان بادشاہوں اور شاعروں کا ذکر کیا جنہوں نے دادِ عشق دی تھی، فرانسیسی اشعار پڑھے اور ساتھ ہی اپنا پتلا بازو تھما کر کمال دکھانا چاہا تھا۔ اس کا بازو کہنی تک کھلا ہوا تھا۔

مجھے اس کی پھسر پھسر اس طرح سنائی دی جیسے ہم پر سرسامی کیفیت طاری ہو ''عشق اور بھوک کی دنیا میں راج ہے۔۔'' مجھے یہ الفاظ معلوم تھے۔ یہ اس انقلابی کتابچے ''شاہ بھوک'' کے سرورق پر، کتاب کے نام کے نیچے ہی لکھے ہوئے تھے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس سے میرے نزدیک ان الفاظ میں خاص وزن اور خاص اہمیت آگئی تھی۔

''لوگ بہلاوا چاہتے ہیں، تسکین چاہتے ہیں — علم نہیں۔۔''

اس خیال نے مجھ کو بالکل ہلا دیا۔

جب میں باورچی خانے سے نکلا تو صبح ہو رہی تھی۔ دیوار پر جو چھوٹی سی گھڑی لگی تھی، اس کے حساب سے چھ بج کر کچھ منٹ ہوئے تھے۔ جمے ہوئے برف سے ہوتا ہوا میں اپنے ٹھکانے کی طرف چلا۔ چاروں طرف طوفان کا شور اور آہ و بکا کی آوازیں تھیں اور اس آدمی کی غصے سے بھری ہوئی چیخ جو میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جو باتیں اس نے کہی تھیں وہ ایک تلخ شراب کا گھونٹ تھیں جو میرے گلے سے نیچے اترا نہ تھا بلکہ گلے میں پھنس کر میرا دم گھونٹے ڈال رہا تھا۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ بیکری کو واپس جاؤں یا لوگوں سے ملوں۔ چنانچہ میرے کندھوں پر جھکتی ہوئی برف کا بوجھ بڑھتا گیا اور میں تاتاری محلے کی گلیوں میں ادھر ادھر مارا پھرتا رہا یہاں تک کہ دن نکل

آیا اور برف کی برسات میں شہر کے رہنے والوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے جاڑے شروع ہونے لگے۔

تاریخ کے اس معلم سے میری پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں اس سے ملنے کا خواہش مند بھی نہ تھا — لیکن آئندہ زمانے میں مجھے اس طرح کی بہت ساری دلچسپ باتیں ملیں — یعنی کہ یہ زندگی حماقتوں سے بھری ہے، محض ایک نئی تجارت وغیرہ — یہ باتیں میں نے جاہل انجانی شہروں اور بے گھر بے در گندوں سے سنیں، ''انسانیت کے محروموں'' سے سنیں، بڑے پڑھے لکھے اور مہذب مردوں اور عورتوں سے سنیں! اس طرح کی گفتگو میں نے ایک مذہبی عالم سے سنی جو [illegible] کی سند لے چکے تھے، ایک کیمیادان سے سنی جو بم بنانے پر تجربات کر رہا تھا اور اور بھی بہت سے لوگوں سے! لیکن ظاہر ہے کہ پختہ عمر میں جب ان خیالات سے تصادم ہوا تو وہ میرے دل و دماغ پر وہ اثر نہیں کر سکے تھے جو اس پہلے تصادم نے کیا — مجھے بالکل چکرا کر رکھ دیا اس نے —

اور یہ ابھی ایک دو سال پہلے کی بات ہے، اس تاریخ کے معلم سے ملنے کے تقریباً تیس سال بعد، میں نے بالکل غیر متوقع طور پر ان خیالات کو لگ بھگ ان ہی الفاظ میں اپنے ایک پرانے ساتھی، ایک مزدور کی زبان سے سنا —

ہم دونوں بڑے کھلے دل سے باتیں کر رہے تھے اور یہ آدمی جو یوں اس کے خود ایک بڑا ''سیاسی رہنما'' ہے اداس مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے لگی لپٹی بالکل نہیں رکھی اور اس خلوص اور کھلی طبیعت سے بات کی جو میرے خیال میں روسی لوگوں کی خاص صلاحیت ہے —

''الکسئی مکسیمچ، میرے عزیز دوست، مجھے ان سب باتوں سے کیا لینا —— سائنس، اکادمیاں، یونیورسٹیاں، ہوائی جہاز؟ میں تو بس ایک ایسا کونہ چاہتا ہوں جہاں مجھے امن نصیب ہو، ایک

ایسی عورت ہو کہ میں جس وقت چاہوں اسے پیار کر سکوں اور وہ میرے بوسوں کا ایمانداری سے جواب دے، جسم سے بھی اور روح سے بھی — سمجھے؟ اور پھر تم اس طرح منطق چھانٹتے ہو جیسے دانش‌ور کرتے ہیں — اب تم ہم میں سے نہیں رہے — تمہارے وجود میں زہر سمو دیا گیا ہے — اب تو خیالات تم کو ہم بےچارے عوام سے زیادہ عزیز ہیں — تم تو ان یہودیوں کی طرح سوچنے لگے کہ انسان اس لئے پیدا ہوا ہے کہ عبادت کرے! کیوں، ٹھیک ہے نا؟"

"لیکن یہودی ایسی کوئی بات نہیں سوچتے...."

"وہ کچھ سوچتے ہوں خدا ہی بہتر جانتا ہے! یہ تو قوم ہی ایسی ہے — کٹھن ہے اس کا سمجھنا —" اس نے اپنا سگریٹ زور سے دریا میں پھینک دیا اور اس کو ڈوبتے ہوئے دیکھنے لگا —

خزاں کی چاندنی رات تھی — ہم دونوں دریائے نیوا کے گھاٹ پر پتھر کی ایک بنچ پر بیٹھے تھے — دن بھر ہم لوگوں پر جذباتی تناؤ طاری رہا تھا اور اب ہم اس سے بالکل تھک چکے تھے — دن بھر ہم اس زوردار اور ناکام خواہش کے تھپیڑے کھاتے رہے کہ کوئی نیک کام، کوئی اچھا کام کریں —

"تم ہو تو ہمارے ساتھ مگر ہم میں سے نہیں ہو،" اس نے سوچتے ہوئے آہستگی سے کہا — "یہ جو دانش‌ور ہوتے ہیں ان کو ہر وقت خیالات میں الجھا رہنا اچھا لگتا ہے — صدیوں سے لیکر اب تک یہ دانش‌ور اپنے آپ کو انقلاب کے ساتھ وابستہ کرتے چلے آئے ہیں — عیسی مسیح کی طرح وہ بھی آدرش وادی تھے اور دوسری دنیا کے لئے بغاوت کر رہے تھے — اسی طرح یہ دانش‌ور ایک خیالی جنت بسا لیتے ہیں اور اس کے واسطے بغاوت کرتے ہیں پھر ہوتا یہ ہے کہ دنیا بھر کے اٹھائی گیرے کٹلے اور تمام کچرا قسم کے لوگ ان آدرش وادیوں کی دم میں لگ لیتے ہیں — ان کے دل میں محض ایک احساس نفرت ہوتا ہے کیونکہ وہ دنیا میں کہیں اپنا ٹھکانا

نہیں دیکھیے ۔۔ لیکن جو مزدور ہوتا ہے، محنت کش ہوتا ہے وہ وہی انقلاب کے لئے بغاوت کرتا ہے — اسے محنت کے ذرائع اور محنت کے پھل کی منصفانہ تقسیم کی ضرورت ہے — کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ مکمل اقتدار حاصل کرنے کے بعد بھی ریاست کو باقی رکھے گا؟ ہرگز نہیں! سب بکھر کر الگ الگ ہو جائیں گے اور ان میں سے ہر ایک یہ چاہے گا کہ اس کا اپنا ایک گوشہ ہو جہاں وہ امن چین سے رہ سکے، ایسی ایک الگ زندگی بسر کر سکے...

''تم کہتے ہو نہ مشینیں ہوں، ٹکنیکل ترقی ہو! لیکن اس سے تو ہمارے گلے میں پڑا ہوا پھانسی کا پھندا اور بھی تنگ ہو جائیگا، ہماری زنجیریں اور بھی مضبوط ہو جائیں گی — ہمیں تو اپنے آپ کو بیکار کی محنت سے بچانا ہے — انسان چاہتا کیا ہے؟ سکون نا! اس سائنس اور ان فیکٹریوں سے ہمیں سکون نہیں نصیب ہو سکتا — اکیلے انسان کو زیادہ نہیں چاہئے — اگر میرے لئے ایک چھوٹا سا گوشہ کسی مکان کا کافی ہو سکتا ہے تو میں کیوں شہر کے شہر کھڑے کروں؟ جب لوگ گروہ بنا بنا کر آبادیاں بساتے ہیں تو پھر ان کو پانی بھی چاہئے اور نل بھی چاہئیں، بجلی بھی چاہئے — لیکن اگر ان سب کے بغیر آدمی کام لے جانے کی کوشش کرے تو زندگی کتنی آسان ہو جائے! تم چاہو جو بھی کہو لیکن ہم لوگوں نے بہت سی چیزیں بلاوجہ اپنے سر پر تھوپ لی ہیں اور یہ تمام چیزیں دانش وروں کے دماغ سے نکلی ہیں! اسی لئے میں کہتا ہوں کہ یہ دانش ور جو ہوتے ہیں نا یہ نہایت ہی خطرناک قسم ہیں انسانوں کی —''

میں نے کہا جس طرح روسی زندگی کو بےمعنی بناتے ہیں اس طرح ڈٹ کر باقاعدہ اور کوئی دوسرا زندگی کو بےمعنی بنانے کا گر نہیں جانتا —

''یہ لوگ دل کے سب سے آزاد ہیں'' اس نے ہنستے ہوئے کہا

''ہاں — خفا نہ ہونا، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں — کروڑوں میری

طرح سوچتے ہیں [illegible] کہ نہیں ہاے — زندگی کی عمر اس طرح ہو کہ اس میں سادگی پیدا ہو۔ ہاں، تب جا کر یہ زندگی تمام لوگوں کو کلیجے سے لگا سکےگی...''

یہ شخص کبھی بھی ''ٹلستانی کا سرو'' نہیں رہا تھا — وہ نراج کے آگے بھی سر نہیں جھکاتا تھا — میں اس شخص کی روحانی عرفان کی تاریخ خوب جانتا ہوں۔

اس سے بات چیت کے بعد میں نے بے اختیار دل میں سوچا: عجب نہ ہو اگر واقعی کروڑوں روسی محض اس لئے انقلاب کے راستے پر گامزن ہیں کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں یہ امید چھپی ہوئی ہے کہ انقلاب ہوگا تو محنت سے ان کی جان چھوٹیگی؟ کم سے کم محنت — زیادہ سے زیادہ راحت۔۔ واقعی یہ بات دل کو کھینچتی ہے اور حوصلہ بڑھاتی ہے، ان تمام چیزوں کی طرح جن کا وجود نہیں، تمام خیالی جنتوں کی طرح!

اور مجھے ہنری ابسن کی نظم یاد آ گئی:

میں ہوں قدامت پرست؟ ارے نہیں!
میں وہی ہوں جو زندگی بھر رہا ہوں —
میں بھیس بدلنا نہیں چاہتا
لیکن جی چاہتا ہے کاش میں یہ سارا کھیل بگاڑ سکتا!
صرف ایک انقلاب یاد ہے مجھے
وہ انقلاب باقی تمام انقلابوں سے بہتر تھا —
یہ انقلاب سب کچھ تباہ کر سکتا تھا
ظاہر ہے میں سوچتا ہوں یہ طوفان نوح ہے
لیکن — اس وقت شیطان نے منتر پڑھا!
آپ جانتے ہیں — نوح بن گیا ڈکٹیٹر
اوہ اگر یہ کام اور بھی ایمانداری سے ہو سکے
تو میں آپ کا ہاتھ بٹانے سے انکار نہیں کروں گا —
ہاں اٹھاؤ اٹھاؤ طوفان نوح اٹھاؤ،
اور میں تمہاری کشتی ڈبونے کو تیار بیٹھا ہوں۔

ٹورسکوف کی دوکان کی آمدنی بہت ہی کم تھی۔ اور جن آدمیوں کو مشورہ کی ضرورت ہوتی تھی، جن لوگوں کو مشورہ کی ضرورت ہوتی تھی، ان کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔

اکثر بار بار کھوئے کھوئے اپنی ڈاڑھی کھجاتے "ہم لوگوں کو کچھ سوچنا پڑے گا۔" کھسیانی ہنسی ہنستے اور پھر افسردگی کے ساتھ مسکرا کر خاموش ہو جاتے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ آدمی اپنے آپ کو ایک ایسا انسان سمجھتا تھا جس کی قسمت میں یہ لکھ دی گئی تھی کہ زندگی بھر کسی انسان کے واسطے محنت مشقت کیا کرے اور غالباً اس نے اپنے آپ کو اس طرح کا عادی بنا لیا تھا۔ پھر بھی ایسے لمحات آ ہی جاتے ہیں جب وہ اس بار کو شدت سے محسوس کرتا تھا۔ میں نے کئی بار گھما پھرا کر اس سے پوچھا:

"آپ یہ سب کس لئے برداشت کرتے ہیں؟"

ظاہر ہے کہ میری بات کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ وہ ہمیشہ میرے اس سوال "کس لئے" کا جواب نہایت کتابی طریقے سے دیتا — ٹھہر ٹھہر کر — عوام کی پریشان حالی اور ان کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے، روشن خیالی اور علم کی ضرورت کا بیان کرنے لگتا۔

"لیکن کیا عوام علم چاہتے ہیں؟ کیا وہ علم کی تلاش میں ہیں؟" میں پوچھتا۔

"یقیناً — ورنہ پھر کیسے ہوگا۔ تم نہیں جانتے ہو کیا؟"

خیال میں تو بے شک جاتا تھا — لیکن مجھے اس تاریخ کے معلم کی بات یاد آئی "لوگ بہلاوا چاہتے ہیں، تسکین چاہتے ہیں — علم نہیں —"

اس طرح کے بزرگانہ خیالات کا سروسامان نوجوانوں سے ٹکراتا رہتا ہے — ایسی ٹکروں سے یہ خیالات کند ہو جاتے ہیں اور نوجوان کو بھی اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

میں یہ تصور کرنے لگا کہ جیسے مجھے ہر جگہ اور ہمیشہ ایک ہی بات نظر آتی ہے: کہانیاں چاہے کتنی ہی دلچسپ ہوں لیکن عوام دراصل ان کو اس لئے پسند کرتے تھے کہ ان کے ذریعہ وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنی اس دکھی زندگی کو بھول جاتے تھے جس کے وہ عادی ہوتے تھے۔ جس داستان میں جتنی ہی زیادہ ہوائی اور خیالی باتیں ہوتی تھیں، من گھڑت چیزیں ہوتی تھیں اتنا ہی زیادہ شوق سے وہ قبول کی جاتی تھیں۔ وہ کتابیں سب سے زیادہ عوام کی توجہ کو کھینچتی تھیں جن میں حسین من گھڑت باتیں ہوتی تھیں — مختصر یہ کہ میں ایک دم گھونٹ دینے والی کہر میں اندھادھند ٹٹول رہا تھا اور سمجھنے میں ناکام رہا تھا کہ حقیقت کیا ہے —

دیرینکوف نے ایک بیکری شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ تخمینہ وغیرہ لگاکے اور باقاعدہ حساب کتاب کرکے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ہر بار جب ہم سامان تیار کرینگے تو ہم کو تقریباً تیس فیصدی کا منافع ہوگا — مجھے اس میں بیکری کے مددگار لڑکے کا کام کرنا ہوگا۔ اور چونکہ میں اسی حلقے میں سے ایک تھا اس لئے اس بات کی نگرانی بھی میرے سپرد کی گئی تھی کہ نان بائی میدہ، انڈے، مکھن یا تیار روٹیاں یا بسکٹ وغیرہ چرا نہ لے —

چنانچہ میری بنیادی حیثیت تو وہی رہی، یعنی بیکری کا کام — لیکن اب میں بڑی دوکان سے ہٹ کر جو گندی تھی، ایک چھوٹی دوکان میں منتقل ہو گیا جو صاف ستھری تھی — اس جگہ کو صاف ستھرا رکھنا بھی میری ہی ذمہ داری تھی — اب ایک ایسے کارخانے کے بجائے جہاں چالیس آدمی کام کرتے تھے میرے ساتھ صرف ایک آدمی کام کرتا تھا — اس آدمی کے بال کنپٹی کے پاس سے پک چکے تھے — چھوٹی سی چگی داڑھی تھی — دبلا سا دھوئیں سے سنولایا ہوا چہرہ — فکر مند سی سیاہ آنکھیں، عجیب سا دہن — چھوٹی مچھلی کی طرح ننھا سا — لیکن موٹے نرم ہونٹ اس طرح سکڑے ہوئے

جیسے وہ اپنے تصور میں کسی کا بوسہ لے رہا ہو، اور اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں تمسخر کی چمک تھی۔

ظاہر ہے کہ وہ چوری بھی کرتا تھا۔ پہلی رات جب ہم لوگ بیکری میں دم لے رہے تھے تو اس نے دس انڈے، ڈیڑھ سیر میدہ اور مکھن کا ایک بڑا سا لوندا اٹھا کر الگ رکھ دیا۔

''یہ کس لئے رکھا؟،،

''ارے یہ ایک ننھی سی لڑکی کے لئے ہے جس سے میری آشنائی ہے،، اس نے خوش‌مزاجی سے جواب دیا اور ماتھا سکوڑ کر بولا ''ایک پیا... اری سی، چھو... ٹی سی لڑکی کے لئے —،،

میں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ دنیا چوری کو جرم سمجھتی ہے — لیکن میری خوش‌بیانی کا عجز صاف ظاہر ہو گیا یا یہ ہو سکتا ہے کہ جو سچی اور صحیح بات میں اس کو سمجھا رہا تھا اس کا میں خود قائل نہ تھا — بہرحال مختصر یہ کہ میری باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔

گندھے ہوئے آٹے کے بکس پر چت لیٹ کر کھڑکیوں سے ستاروں کو دیکھتا ہوا خفگی کے الفاظ بڑبڑانے لگا:

''ہونہہ، ذرا دیکھو — وہ مجھے نصیحت کرتا ہے — ابھی پہلی بار مجھ کو دیکھا ہے اور شروع ہو گئے حضرت لکچربازی پر — بھلا میری عمر ان سے تین گنی ٹھہری — کیا خوب! عجیب بات ہے...،،

جب ستاروں کا معائنہ کر چکا تو مجھ سے پوچھا:

''مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے پہلے بھی تم کو کہیں دیکھا ہے — تم اس سے پہلے کہاں کام کرتے تھے؟ سمیونوف کے ہاں؟ جہاں فساد ہوا تھا؟ اچھا — مطلب یہ کہ میں نے تمہیں خواب میں دیکھا ہوگا...،،

چند دن میں میں نے دیکھا کہ یہ شخص جتنا اور جہاں چاہے سو سکتا ہے، ہر پوز میں، ہر حال میں، کھڑا ہے تو کھڑا سو رہا

ہے۔ سوتے میں اس کی جوش خروش خاص، ہمیشہ مل کر کچھ عجیب سا لگنے لگتا، اس کے چہرے سے ایک عجیب حیرانی کی کیفیت ساری رہتی۔ اس کا سب سے من پسند موضوع تھا دفینوں اور خوابوں کا قصہ — وہ بڑے یقین سے کہتا:

"میں زمین کے اندر دیکھ سکتا ہوں۔ پوری زمین بالکل کھوکھلی ہے کھوکھلی: دفینوں اور خزانوں سے بھری ہوئی — زر و جواہر کی تھیلیاں، صندوق، کٹورے۔ کئی بار کچھ ایسا ہوا — خواب میں دیکھتا ہوں کہ کوئی جگہ چمکتی ہے۔ وہاں کو جاتا ہوں ہے... کونے میں ماسٹی کے برسوں سے گڑا ہوا صندوق جگمگ جگمگ رہا ہے۔ آنکھ کھل گئی — رات کے وقت ہی جی کرتا اس جگہ کھدائی کروں۔ کوئی کدال لے کر کھدائی کی ہوتی کہ دیکھتا ہوں سامنے کونے میں کسی کی کھوپڑی پڑی ہے — لو دیکھ لو، کھوپڑی ہے! اچانک — دھڑام! کھڑکی کھلی اور کوئی عورت چیخ رہی ہے "چور، چور!" میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا — جو پکڑا جاتا تو میرا کچومر نکال دیتے! کتنی عجیب بات ہے!"

میں ہر بار یہ لفظ سنتا — عجیب! لیکن کوئی ہنستا نہیں، وہ صرف مسکراہٹ بھری آنکھیں سکیڑتا ہے، ناک پر بل ڈالتا ہے، نتھنے پھلاتا ہے۔

اس کے خواب بے رنگ ہیں، خود حقیقت کی طرح بے جان اور بے رنگ۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اپنے خواب اپنے جوش و خروش سے کیوں سناتا ہے اور اس کے چاروں طرف جو حقیقتیں پھیلی ہوئی ہیں، ان کا ذکر بھی اپنی زبان پر لانا نہیں چاہتا۔

یکایک شہر میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی: ایک امیر شراب خانے کے سوداگر کی لڑکی نے اپنی شادی کے فوراً ہی بعد اپنے شوہر کو مار کر خود کشی کر لی کیونکہ اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کی گئی تھی — شہر بھر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کئی ہزار نوجوانوں

؛ سلسلہ وار جھگڑا [illegible] جس نے جلدی ہی [illegible] ہوا اور طالب علموں نے اس کی قدر پر عزیز تر کی — آخرکار نوسوں نے زبردستی ان کو مسمر کیا — ہماری چھوٹی سی دکان میں بھی غیر سنجیدہ [illegible] کر اس سانحے پر تبصرہ شروع ہو گیا اور دونوں کے سمجھنے والا لمحہ جوش میں بھرے ہوئے، بھاگتے ہوئے طالب علموں نے ان کا ساتھ — غصے میں بھری ہوئی یہ آوازیں اور زہریلے الفاظ کہ یہ ہمیں مجھے سمجھ جانے میں ہم لوگوں تک بھی پہنچ رہے تھے —

نوسوں نے زبانی دی "تجھ میں اس لڑکی کی پٹائی کر اور زیادہ کی تھی ہوتی تو اس وقت یہ نوبت نہ پہنچتی —" پھر اسی سانس میں مجھ سے مخاطب ہوا "میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک مچھلی کا شکار کر رہا ہوں تالاب پر — اور یکایک ایک [illegible] نازل ہوا: "خبردار، تم جانتے ہو تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" اور جب تیرنے کی جگہ نہیں تھی — اس لئے میں تالاب میں کود پڑا اور ایکدم آنکھ کھل گئی!"

اگرچہ حقیقت پرستی اس کے ذہن کے نزدیک نہیں آس پاس بھٹکی بھی نہیں تھی لیکن جلد ہی اس کی سمجھ میں آنے لگا کہ ہماری بیکری کا معاملہ کچھ غیر معمولی تھا: دکانوں کو جنس وغیرہ ایسی چیزیاں دیتی تھیں جو اس کام کے لئے بالکل غیر موزوں تھیں، بڑی لڑکی، کتابیں پڑھنے والی لڑکیاں —— ان میں سے ایک تو خود دوکاندار کی بہن ہی تھی اور دوسری اسی بہن کی ایک دوست تھی —— لمبے قد، سرخ سرخ گال، محبت بھری شفیق آنکھیں — روزانہ طالب علموں کا مجمع ہوتا، پچھلے کمرے میں گھنٹوں تک آہستہ آہستہ کھسر پھسر ہوتی یا زور زور سے بحث چلتی رہتی — دوکاندار خود شاذ ہی نظر آتا اور میں جو بیکری کا "جھونپڑا" سمجھا جاتا تھا، کہ وہیں منیجر کی حیثیت رکھتا تھا —

نوسوں نے مجھ سے پوچھا "تم کیا مالک کے رشتے میں کچھ لگتے ہو؟ ممکن ہے وہ تمہیں اپنا بہنوئی بنانے کی سوچ رہا

ہو نہیں؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے — اور یہ سب طالبِ علم یہاں کیوں منڈلاتے رہتے ہیں؟ ان لڑکیوں کی وجہ سے نا... ہوں، مگر یہ جو تمہاری لڑکیاں ہیں یہ دیکھنے میں تو کچھ ایسی خاص ہیں نہیں۔ میں تو کہوں گا کہ یہ طالبِ علم زبان حاصل کرنے آئے ہیں، لڑکیوں کو خوش کرنے نہیں —،،

تقریباً روزانہ ہی صبح پانچ چھ بجے ایک لڑکی کھڑکی کی چوکھٹ پر آکر بیٹھ جاتی۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور جسم ہر طرف کو مختلف زاویوں سے اس طرح نکلا ہوا جیسے کسی بوری میں چھوٹے چھوٹے خربوزے بھرے ہوئے ہوں۔ وہ ٹھوڑی کھڑکی پر سر ٹکا کر بیٹھ جاتی اور آنکھیں ملا ملا کر جماہی لے لے کر پکارتی جاتی:

’’وانیا، او وانیا!،،

اس کے بال سنہرے اور گھنگھریالے تھے جو سر پر بندھے ہوئے رنگین رومال کے نیچے سے بکھر کر خوب سخت سخت گچھوں کی شکل میں اس کے جھکے ہوئے ماتھے، سرخ اور غبارے کی طرح پھولے ہوئے گالوں پر لٹکتے رہتے — نیند سے چندھیائی آنکھوں میں بھی وہ چھلے گھستے چلے جاتے اور وہ ننھے ننھے ہاتھوں سے سستی کے ساتھ انہیں پیچھے کو دھکیلتی جاتی۔ ساتھ ہی وہ اپنی انگلیوں کو بڑے مضحکہ خیز طریقے سے ہلاتی رہتی جیسے کوئی نوزائیدہ بچہ۔ میں اکثر یہ سوچ کر حیران ہوتا کہ اس طرح کی لڑکی سے کوئی کیا بات کر سکتا ہے — جب میں اس نانبائی کو جگاتا تو وہ وہیں سے کہتا:

’’ہوں، تو یہ تم ہو؟،،

’’ہاں، میں ہوں —،،

’’سوئیں نا؟،،

’’کیوں نہ سوتی؟،،

’’کیا خواب دیکھا؟،،

''شاد رہیں...''

سارا شہر خاموش ہے — لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ بالکل سناٹا ہی نہیں — کسی مہتر کی جھاڑو کہیں سرا سر چل رہی ہے اور چڑیاں جو ابھی جاگی ہیں انہوں نے چہچہانا شروع کردیا ہے — سورج کی نرم گرم شعاعیں اٹھ اٹھ کر کھڑکیوں کے شیشوں میں اپنے عکس سے گلے مل رہی ہیں — مجھے یہ خاموش لمحات بہت پسند ہیں جبکہ دن میں شروع ہی ہورہا ہو — نانبائی نانوں سے بھرا ہوا چھبہ لیے ہوئی کھڑکی کی طرف بڑھتا ہے اور منجھلی لڑکی کی ٹانگیں پکڑ لیتا ہے — وہ بڑی بے پروائی کے ساتھ یہ معاملہ کرنے دیتی ہے، مسکرائی تک نہیں — صرف اپنی بھوری کی سی آنکھیں نیند بھرے پن سے جھپکاتی رہتی ہے —

''بسکوف، اب وہ میٹھی چیزیں نکال لو باہر، ہوگئی ہوں گی!''

میں لوہے کی سینیوں کو تندور سے باہر کھینچتا ہوں — وہ نانبائی دس پانچ نان اور کلچے وغیرہ اٹھا لیتا ہے اور ان کو لڑکی کی گود میں پھینک دیتا ہے — وہ جلدی جلدی سینے پر سے ایک کلچے کو دونوں ہاتھوں میں الٹتی پلٹتی ہے اور پھر اپنے چوہے کے سے پیلے دانت اس میں گڑو دیتی ہے، منہ جل جاتا ہے، کراہتی ہے اور بے صبری سے ٹھنٹھناتی ہے — نانبائی اس کو پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہتا ہے:

''اپنا فراک تو نیچے کر، چھنال...''

جب وہ چلی جاتی ہے تو مجھ سے بڑے فخر سے کہتا ہے:

''جیسے پہاڑ کا ممنا! وہ جو موسم بہار میں پیدا ہوتا ہے — ایسا گھونگھر ہی گھونگھر — میں اس طرح کی چیز پر بری طرح مرتا ہوں — دراصل میں عورت کو کبھی نہیں اپناتا، صرف لڑکیوں کو کام میں لاتا ہوں — نیکیفورچ کی دینی بیٹی ہے یہ اور میری — پیرھوبی ہے!''

میری ان خوبصورت باتوں کو سنتے ہوئے میں نے اس سے سوال کیا
''اور میں؟ کیا میں اسی طرح جیوں گا...''

سادھو کی جو بڑی بڑی اور سفید داڑھی رومال بھر کے حساب سے بکھری تھی وہ جیسے ہی [illegible] تو میں دس بارہ عدد ایک تھیلی میں رکھ لیتا اور جلدی جلدی قدم اٹھاتا اُن کو [illegible] کی جانب دوڑ کر پہنچا آتا — جب یہ کام ختم ہو جاتا تو میں ایک [illegible] میں نان اور [illegible] اچھے بھلے اور مذہبی آدمی کی طرف ٹھہری کے لئے نکل [illegible] طالب علموں کے ناشتے کے وقت صبح سکول میں نہانے کے بعد [illegible] کمرے کے دروازے کے پاس اندر [illegible] جاتا اور وہیں کھڑا کھڑا طالب علموں کے لکچر سمجھ لیا کرتا [illegible] بھی اور ادھار بھی — اور بڑے اشتیاق سے ان کی بحث سنتا جو ہندوستانی کے متعلق ہوتی — [illegible] کے پروفیسروں میں ایک شخص [illegible] تھا جو ہندوستانی کا جانی دشمن تھا اور اس کے خیالات کا سخت مخالف — کبھی کبھی میری کوٹھڑی میں [illegible] وغیرہ کے بیچ [illegible] ہوتی تھیں، جیسے تو کسی طالب علم [illegible] سمجھنے کے لئے — کبھی کبھی یہ لوگ بھی میری کوٹھڑی میں [illegible] پرچے وغیرہ رکھ دیا کرتے تھے —

ہفتے میں ایک دو بار میں [illegible] نکل جاتا تھا — ''[illegible]'' کی طرف، جہاں ایک ماہر نفسیات جو نفسیاتی علاج بھی کرتا ہے، لکچر دیا کرتا تھا اور اپنے طالب علموں کے سامنے مریضوں کا معائنہ بھی کروایا کرتا تھا — اس پروفیسر کا نام بیختریف تھا — ایک دن اس نے طالب علموں کو ایک مریض دکھایا جو اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھنے کے خبط میں مبتلا تھا — جب یہ مریض لکچر ہال کے دروازے پر آیا تو میں اس کو دیکھ کر مسکرا پڑا — [illegible] لمبا آدمی، جسم پر [illegible] کا سفید لباس، سر پر ایک ٹوپی [illegible] بانکی رکھی ہوئی، لیکن جب وہ میرے پاس سے گزر کر ہال کی طرف جانے لگا تو پل بھر کے لئے ٹھٹھک کر

اس نے مجھے گھورا۔ میں ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک دم سے لگا جیسے اس کی سرخ سی نگاہوں نے جو شعلے کی طرح سیدھی مگر پھر بھی نکلتی ہوئی تھیں، میرے دل پر ایک صدمہ سا ضرب لگائی۔ لکھنؤ کے دوران میں مصروف ہو جانے والی عجیب لہجہ کر اس سری سودائی سے بڑے احترام کے ساتھ پیش آئے رہے اور میں دیر تک اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے رہا کیونکہ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسی ہوئی رات کی ٹھوکر کا ایک طمانچہ کسی نے میرے منہ پر مار دیا ہے۔

وہ شخص ایک عجیب سی آواز میں مسلسل کچھ بکے جا رہا تھا۔ اس کی آواز کھردری اور بھاری تھی۔ دھمکی کے انداز میں اس نے ایک لمبا سا شملہ عمامہ پر لگا رکھا تھا ہوا تھا اور اپنے لبادے کی لمبی آستین سے کبھی کبھی سرخی سرخی آنکھیں ملتے ہوئے تھا۔ مجھے اس کا پورا جسم کچھ عجیب سا لگ رہا تھا جیسے غیر فطری طریقے سے کھینچتا جا رہا ہو اور کھنچ کر بڑھ کر لمبا ہوتا جا رہا ہو، یہاں تک کہ مجھے ڈر لگنے لگا کہ وہ تانبے کے سے رنگ کے بازو کو حرکت دے کر کھینچ کر کمرے کے اس سرے سے اس سرے تک پہنچ جائے گا اور میرا گلا دبا دے گا۔ اس کے گندمی چہرے میں آنکھیں دو تاریک گڑھوں میں بیٹھی ہوئی لگتی تھیں لیکن ان سیاہ آنکھوں میں چھوٹے جیسے جلتے ہوئے لال سے تھے اور ان میں سے تحکم اور دھمکی کے شعلے نکل رہے تھے۔ میں جیسے طلسم کی حالت میں اس آدمی کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور نہایت توجہ سے اس کا مطالعہ کر رہا تھا —— اس آدمی کا مطالعہ جو مسخروں کی طرح سانگ رچائے ہوئے تھا۔ چند ایک مسکرا رہے تھے لیکن زیادہ تر سنجیدہ اور غور و فکر میں غرق۔ اس شخص کی شعلہ بار آنکھوں کے مقابلے میں ان صاحب علموں کی آنکھیں غیر معمولی طور پر معمولی لگتی تھیں۔ اور اس کو دیکھ کر واقعی ڈر لگتا تھا کہ ایک خاص شاہانہ انداز تھا —— واقعی تھا!

طالب علموں کی خاموشی اور سعید نی کے درمیان پروفیسر کی اونچی آواز صاف سنائی دیتی۔ جب وہ کوئی سوال پوچھتے تو اس مریض کی بے جان آواز جھجکنے لگتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ یا تو فرش کے نیچے سے کہیں سے آواز آرہی ہے یا بند دیواروں کے پیچھے سے کہیں سے آرہی ہے۔ اس سودائی کے حرکات و سکنات آہستگی کے ساتھ ہوتے تھے اور ایسے وقار کے ساتھ جیسے وہ کوئی بہت بڑا بہادری ہو۔

اس زمانے میں میں نے اس شخص پر شعر لکھے جن میں اس کو ''ملک الملوک، ندیم و مشیر پروردگار'' لکھا۔ بہت عرصے تک وہ میرے خیالات پر چھایا رہا جس کی وجہ سے ذہنی الجھن ہوتی تھی۔

چونکہ شام کے چھ بجے سے اگلے دن دوپہر تک میں مصروف رہتا تھا اس لئے سہ پہر کے وقت سوتا تھا۔ مطالعہ کرنے کے لئے کوئی وقت نہیں ملتا تھا۔ دن کے درمیان جو فرصت ہوتی تھی بس وہی ہوتی تھی جیسے ایک گھان کا آٹا گوندھا جا چکا ہے، دوسرے کا ابھی خمیر نہیں اٹھا ہے اور تندور میں روٹیاں لگی ہیں ——— تو یہ بیچ کا وقت مل جاتا تھا۔ جیسے جیسے مجھے اس کاروبار کے داؤ پیچ کا پتہ چلتا گیا اور اس کے راز معلوم ہوتے گئے، ویسے ویسے نانبائی نے ایسا کام سکھانا شروع کیا اور زیادہ تر محنت کا کام میرے سر تھوپنے لگا ——— اور بہانہ یہ کرتا کہ ''کام سکھا رہا ہے''۔ بڑی محبت سے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے کہتا:

''تم تو بڑے قابل ہو۔ ایک دو سال میں تو پورے نانبائی ہو جاؤ گے۔ عجیب بات ہے! تمہارا جیسا چھوکرا ——— بھلا کون تمہاری بات سنے گا اور کون تمہارا رعب مانے گا۔۔۔''

مجھے کتابوں کا جو شوق تھا وہ اسے پسند نہ تھا ——— انتہائی خیرخواہی سے رائے دیتا:

"ابے چھوڑو پڑھنا وڑھنا — ذرا دیر سو رہو نا...." لیکن اس نے مجھ سے یہ کبھی نہیں پوچھا کہ جو کتابیں میں پڑھتا تھا، ان میں تھا کیا؟

وہ خود تو بس اپنے خوابوں، نیندوں، خراٹوں اور اپنی چھوٹی کمسن معشوقہ میں کھویا رہتا تھا کہ جب کبھی جاڑے کی اکثر راتوں کو بھی آتی اور وہ اسے کمرے میں لے جاتا جہاں میدے کی بوریاں رکھی رہتی تھیں — اگر سردی ہوتی تو پیشانی پر بل ڈال کر مجھ سے درخواست کرتا:

"ذرا آدھ گھنٹے کے لئے باہر چلے جاؤ بھئی!"

میں باہر نکل جاتا اور اس بات پر غور کرتا کہ کتابوں میں جس عشق کا حال بیان کیا جاتا ہے اس میں اور اس عشق میں کس قدر بھیانک قسم کا فرق ہے —

میرے مالک کی بہن دوکان کے پچھلے والے چھوٹے کمرے میں رہتی تھی۔ میں دن بھر اس کے واسطے سماوار گرم کیا کرتا تھا لیکن اس سے ملتا بہت کم تھا کیونکہ اس کو دیکھتے ہی مجھے گھبراہٹ سی ہوتی تھی — اس کی معصوم آنکھیں بالکل اسی بے باک طریقے سے مجھ کو گھورتیں جیسے پہلی ملاقات میں گھورا تھا — اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ان آنکھوں کی گہرائیوں میں کہیں کوئی مسکراہٹ چھپی ہوئی ہے جو میرا مذاق اڑا رہی ہے۔

دراصل میری بے پناہ جسمانی طاقت میرے لئے ایک مصیبت بن گئی تھی — جب میں میدے کی من من بھر کی بوریاں اٹھاتا تو نانبائی بڑے رحمدلی کے انداز میں کہتا:

"تم میں تو بس تین آدمیوں کی طاقت ہے مگر ذرا بے ڈھنگے ہو، بیل کی طرح لگتے ہو کیونکہ [illegible]...."

اس وقت تک میں کافی مطالعہ کر چکا تھا — شعر سے مجھے دلچسپی تھی، خود بھی شعر کہتا تھا لیکن بات چیت میں کتابی

الفاظ کی جگہ میں نے ایسے الفاظ کا ہی استعمال جاری رکھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ الفاظ کھردرے اور بھاری ہیں۔ لیکن مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہی اور صرف یہی الفاظ میرے خیالات کے اظہار کو پوری طرح زبان دے سکتے ہیں، [illegible] ہیں۔ کبھی کبھی میں [illegible] بات کے خلاف احتجاج کرتے وقت غصے اور سخت کلامی [illegible] کسی بات کے خلاف سچ مچ احتجاج کرتا تھا یہ اب کہہ نہیں سکتا۔ جب کوئی ایسی بات ہوتی تھی جو حد سے بڑھی ہوئی لگتی تھی، تو وہ مجھے کھلتی تھی اور جبر کی وجہ سے میں قابو سے باہر ہو جاتا تھا۔

میرے استادوں میں سے ایک نے جو ریاضی کے طالب علم تھے، اس سلسلے میں مجھے فہمائش کی تھی:

"اوہ — یہ بات کرتے ہو، [illegible] کی مار — [illegible] کرتے ہو کہ لوگ کے [illegible] اٹھا [illegible] مارے ہو۔"

ہر سکول کی اجتماعی [illegible] کہ مضمون [illegible] میں ہوتے تھے۔ میں اپنے آپ سے مطمئن نہیں تھا۔ اپنے آپ کو مضحکہ خیز اور بدشکل سمجھتا تھا۔ پھر میری صورت بھی ایک مسئلہ تھی، [illegible] کی ابھری ہوئی ہڈیاں، [illegible] کی طرح، اور میری آواز جو [illegible] قابو سے باہر تھی۔

اس کے برخلاف میرے ساتھی کی ہستی بھرپور اور سبک خرام تھی جیسے کوئی اڑتی ہوئی چڑیا۔ لیکن مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا پیرہن اس کے [illegible] گول مٹول چھوٹے جسم سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے حرکات و سکنات اور چال ڈھال میں کچھ ایسی بات تھی جو لگتا تھا ایسی نہیں ہے کہ جان بوجھ کر کی جارہی ہے۔ اس کی آواز مسرت انگیز تھی، اور وہ ہنستی تھی۔ [illegible] اس کی ہنسی [illegible] مجھے معلوم ہوا کہ اس کی کوشش یہ ہے کہ میں اس کی وہ حالت بھول جاؤں جس میں میں نے اسے پہلی ملاقات میں دیکھا تھا۔ اور میں اس لمحے کو بھولتا نہیں

چاہتا تھا — میرے لئے ہر وہ نقش اہم اور قیمتی تھا جو غیر معمولی تھا کیونکہ مجھے ایک خاص شوق یہ تھا کہ غیر معمولی حالات کے امکانات دیکھ سکوں!

کبھی کبھی وہ پوچھتی:

"آج کل آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟"

میں بہت مختصر جواب دے دیتا حالانکہ اس کا پوچھنے کو بے ساختہ جی چاہتا کہ "میرے پڑھنے سے آپ کو کیا تعلق؟"

ایک رات مالکنی نے کچھ نشے کے عالم میں اپنی محبوبہ کو پیار کرتے ہوئے مجھ سے کہا:

"ذرا ماسٹر جی سے کہنا — پڑے رہتے ہیں جا کر کسی لڑکی کی پھول سے کیوں نہیں دل بہلاتے — ایسے موقع ہاتھ سے جانے دے رہے ہو کیوں؟ آخر وہ طالبِ علم لوگ بھی تو..."

میں نے سن تو لیا، کہ اگر اب اس نے ایسی بات کہی تو دھکے کے ساتھ اس کی کھوپڑی چٹخا دوں گا! پھر میں کمرے میں کمرے کی کھڑکیوں کو سمجھ گیا — کھلے ہوئے دروازے میں سے مالکنی کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی:

"میں کیوں خفا ہوں؟ سارے دن کتابیں چاٹنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے — بیچارہ مارا پھرتا ہے بڑی سودائی کی طرح!"

کمرے میں ہوتے ادھر سے ادھر سر مار کے پھاڑتے پھر رہے تھے، بیکری سے لڑکی کے کراہنے اور ایسی چیزوں کی آوازیں آ رہی تھیں — میں اٹھ کر باہر احاطے میں چلا گیا — نہایت لطیف قسم کی پھوار آہستہ آہستہ قریباً خاموشی کے ساتھ گر رہی تھی — لیکن ہوا کی گھٹن اس سے کم نہیں ہو رہی تھی، کہیں سے جلنے کی بو آ رہی تھی — شاید کہیں جنگلوں میں آگ لگ گئی تھی — آدھی رات گذر چکی تھی — بیکری کے سامنے مکان کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور کمروں کی نیم تاریکی سے ایک لمبا سا دھواں سا نکل رہا تھا:

کئے گذرے زمانے کا وارلاس
جس کے سر پر ہے سورج کا ہالہ
اپنی امت کو ہے مسکرا دیکھتا...

میں نے اسے تصور میں دیکھا کہ [illegible] اسی طرح میرے سامنے [illegible] ہے جیسے [illegible] کی معشوقہ اس کے سامنے ہو [illegible] — اور میرے جسم کے ہر رونگٹے نے صدا دی کہ [illegible] کی یہ وحشت ضروری تھی۔

صبح سے شام تک
معبود ازل [illegible]
[illegible]
ارے ہاں اور نہیں تو کیا
رحمت کا کاروبار چلا [illegible]
ارے ہاں۔

[illegible] نے سرِ شام ایک اُبھری، رسیلی، [illegible] سورج [illegible] تو دوسری [illegible] کہ [illegible] میں سے دیکھا [illegible] ایک [illegible] اس شخص کے سامنے، کھڑکی کی طرف منہ کیے۔ [illegible] نہیں وہ سراپا ہی اور [illegible] ایک [illegible] جو سورج اللہ کے سر پر سے [illegible] تو [illegible]۔ اس کی [illegible] نہیں، چہرے پر مسکراہٹ کی [illegible] [illegible] اطمینان [illegible] [illegible]

[illegible] میری [illegible] کے [illegible] تک بڑھا، دوسرے [illegible] میں [illegible] نکلتا۔ پھر وہ [illegible] کے [illegible] جیسے صبح کا سفید جھنڈا [illegible] ہوئی اور دل بجھا [illegible] کمرے کے دوسرے کونے میں [illegible] میری نظروں [illegible] جب وہ [illegible] بالآخر اندر جا چکی تھی، اس کے [illegible] اور [illegible] اس کے [illegible] اور [illegible] میں [illegible] ہو گئی [illegible] انسان [illegible] ہو [illegible] کی اس رات کی ہر [illegible] عجیب [illegible] میں ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ [illegible] جب [illegible] کمرے میں [illegible] عجیب [illegible]

لیکن جب وہ [illegible] کے [illegible] سے ملنے آیا تھا اور [illegible] باتوں کے [illegible] رہا، بالکل [illegible] جیسے [illegible] جیسے [illegible] نظر آئے [illegible] کہ وہ [illegible] کی طرف [illegible] اور اسے [illegible] کے [illegible] وہ [illegible] بالوں والا [illegible] تھا [illegible]

نتاشی کی معشوقہ [illegible] میں [illegible] سی ہوتی نکلی اور [illegible] سے مخاطب ہو کر غرائی:

''اب جاؤ اندر...''

نتاشی [illegible] ہوئے [illegible] ہوئے اس معشوقہ کی [illegible] کے [illegible] اس کی [illegible] ساتھ [illegible] سکی [illegible] سوچ [illegible] رہا:

''آخر میں کدھر کو جا رہا ہوں؟''

اور مجھے اب محسوس ہوا کہ کہیں بہت ہی قریب، دیوار کی آڑ میں میری [illegible] میرا انتظار کر رہی ہے۔

بہار کی ابھی [illegible] رہی تھی کہ ڈریکولوں نے ایک بڑے محل کی تلاش شروع کر دی تھی اور یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ ایک اور نوکر رکھ لیں گے۔ یہ ٹھیک بھی تھا اور بہتر بھی کیونکہ میرے سر پر بہت کام تھا اور میں تھکن سے بےحواس ہو جاتا تھا۔

تاتانی نے مجھ سے وعدہ کیا "جب اس نئی جگہ سینئر مددگار ہو گے — میں سفارش کروں گی کہ لوگ تمہاری تنخواہ دس روپے تک بڑھا دیں۔ ایسا تو ہونا ہی چاہئے.."

لیکن مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ مجھے سینئر مددگار بنانے کی فکر میں کیوں تھی۔ اس کو مجھ سے بے حد محبت ہو گئی اور میں جی لگا کر کام کرتا تھا — میرے لئے [illegible] ویسے بھی [illegible] بھی کیونکہ اس سے میری ذہنی الجھن کسی قدر کم ہو جاتی تھی اور [illegible] ہوئی جنسی خواہش کا مقابلہ کر سکتا تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تھکن کی وجہ سے سرشاری مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔

تاتانی کہا "اچھا ہوا جو تم نے ان کمینی لڑکیوں کو چھوڑ دیا۔ [illegible] جو عورتیں ہوں [illegible] کی [illegible] تھوڑا [illegible] یہ بات یاد رکھو کہ ہم تم سچ مچ کبھی خواب بھی دیکھیں، دیکھنے تو ضرور چاہئیں، مگر ذرا سمجھ بوجھ سے، یہ خوب صورت بات ہے — کیونکہ اگر خوب بیان کرنے [illegible] طرح [illegible] ہے — اس سے کسی کا بگڑتا ہی کیا ہے!"

وہ ہمیشہ بہت دوستانہ سلوک روا رکھتا تھا [illegible] بلکہ ایسا جیسے وہ میرا احترام کرتا ہو — [illegible] جانتا تھا کہ میں خوب زندہ ہوں کیونکہ میں مالک کا خاص آدمی تھا حالانکہ پھر بھی وہ باقاعدہ روزانہ چوری کرنے سے کبھی باز نہیں آیا۔

[illegible] جان نکلتی ہو [illegible] ان کے دفن ہونے کے سات دن بعد مجھے خط ملا۔ میرے ماموں زاد بھائیوں میں سے ایک کا خط تھا جس نے مجھے نانی اماں کے انتقال کی خبر دی۔ اس خط سے حقیقت مجھ پر کھلی۔ نانی اماں کی موت کی داستان معلوم ہوئی کہ وہ ٹھیک ٹھاک تھیں [illegible] دو ماہ پہلے وہ برآمدے سے گر پڑی تھیں اور ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ آٹھ دن بعد ہی ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں زہر پھیل گیا — بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ میرے دو بڑے ماموں زاد بھائی اور ایک ماموں زاد بہن مع اپنے بچوں کے، یہ سب بھی اماں پر جان دیتے تھے اور ان کی ٹانگ ٹوٹنے کے بعد خدمت کرتے رہے — لیکن ان کمبختوں میں سے کسی کو اتنی سمجھ نہ تھی کہ نانی اماں کے لیے ڈاکٹر کو بلا لیتے — میرے ماموں زاد بھائی نے لکھا:

"ہم لوگوں نے ان کو پیرو وولسک کے قبرستان میں دفن کیا جہاں ہمارے خاندان کے تمام لوگ دفن ہیں۔ ہم لوگوں کے علاوہ جنازے میں بے شمار فقیر بھی شامل تھے کیونکہ وہ سب نانی اماں سے محبت کرتے تھے اور وہ لوگ رو رہے تھے — [illegible] بھی رو رہے — انہوں نے ہم لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا اور اکیلے ان کی قبر پر رہے — ہم لوگوں نے جھاڑیوں میں سے دیکھا تو وہ بچوں کی طرح رو رہے تھے — اب وہ بھی جلد ہی مر جائیں گے، بچیں گے نہیں ——"

میں نہیں رویا، لیکن مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ مجھے محسوس ہوا تھا کہ جیسے یخ بستہ سرد ہوا نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور میرا سارا وجود سرد ٹھٹھرا جا رہا ہے — اس رات جب میں احاطے میں لکڑی کے ڈھیر پر بیٹھا تھا تو میرے دل میں قیامت کی ہلچل اٹھ رہی تھی کہ کوئی پاس ہوتا جس سے میں نانی اماں کا ذکر کرتا، ان کے متعلق بات کرتا اور اس کو بتاتا کہ میری نانی اماں کس قدر عقلمند اور کیسی نیک دل تھیں، کس طرح وہ سب کے لئے ماں کی حیثیت رکھتی تھیں [illegible] بڑی مدت تک اس ارمان کا بوجھ

دل [illegible] میں [illegible] مزا بھرا [illegible] ٹوٹی [illegible] حس [illegible] لڑکے [illegible] کو [illegible] کروں۔ [illegible] سکوں [illegible] ہی وہ آگ رفتہ رفتہ خود ہی جل بجھی [illegible]۔

کئی سال بعد [illegible] مجھے [illegible] جب میں نے چیخوف کی معرکہ آرا اور حقیقی انسانی [illegible] جس میں ایک نوجوان ہے جو اپنے [illegible] کی موت [illegible] اپنے [illegible] رہتا ہے اور یوں [illegible] افسوس ہوا کہ اس [illegible] چھوڑ [illegible] نہیں [illegible] کی نہیں [illegible]۔ افسوس [illegible] نہیں [illegible] میں [illegible] ہوئے [illegible] بہت [illegible] اور میری ال سے بنتی بھی بہت تھی۔

سوسیو [illegible] کی طرح میرے [illegible] طرف [illegible] لگا۔ وہ محسوس [illegible] ہوئے جسم [illegible] چھوٹے چھوٹے [illegible] ہوئے رو [illegible] ہوئی [illegible] بازار [illegible] ہوئی اور اس میں سلیقے [illegible] کی [illegible] طرح مجھے [illegible] جیسا [illegible] ہوئے والد [illegible] چوٹی [illegible] کوئی لالچی نظروں سے دیکھے۔

''میں نے [illegible] پڑھنے [illegible] ہو، وہ شروع [illegible]۔ ''تو [illegible] اس [illegible] کی [illegible] پڑھتے ہو [illegible] کی زندگی سے متعلق ہو کی کتاب؟ کیوں؟''

[illegible] کہ میں [illegible] اور ولیوں کی زندگی کے [illegible] وغیرہ سے [illegible] واقف تھا [illegible] تو اس پر تعجب ہوا اور کسی قدر [illegible]۔

''ہوں۔ [illegible] کی پڑھائی [illegible] بھی ہے! اور ٹونٹ [illegible] کبھی اس کی لکھی ہوئی چیزیں بھی پڑھی ہیں؟''

اس نے [illegible] کہ میں پڑھا ہوا ہوں [illegible] مطلب سمجھتا ہے کہ وہ ناولیں نہیں پڑھی جاتیں جن میں پولیس والے [illegible] ہو [illegible] ان کی بھی بڑی شوقین تھی —— یہ تو معمولی چیزیں تھیں جیسی [illegible] بھی لکھتے تھے مگر نہیں [illegible] وہ ایک دوسری قسم کی چیزیں بھی تو لکھ رہے تھے جس کے متعلق لوگوں میں [illegible] خوب شہرت ہو رہی ہے۔ ان چیزوں میں اس نے [illegible] کی بڑی مخالفت کی ہے۔ وہ ہوں گی پڑھنے کے لائق —،،

میں نے یہ "دوسری قسم کی [illegible]،، [illegible] ذہن میں [illegible] سمجھنے [illegible] کی نہیں [illegible] وہ [illegible] چیزیں نہیں [illegible] جن کے [illegible] پولیس والوں سے [illegible] لیا جائے —

مجھے [illegible] نے بتایا اس طرح کی مختصر [illegible] رہی، پھر ان بڑے میاں نے مجھے اپنی "کوٹھری،، میں آنے کی دعوت دینی شروع کی۔ ویسے تو میں سمجھ گیا کہ وہ دراصل کس بات کی تلاش میں ہے لیکن پھر بھی میرا دل چاہتا تھا کہ چل کے دیکھوں تو سہی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے صلاح کی اور فیصلہ یہ ہوا کہ پولیس والے کی اس دعوت کو ٹھکرا دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس بیکری اور یہاں آنے جانے والوں پر زیادہ شبہ کی نظر رکھے گا —

لہٰذا میں نیکفورچ کی "کوٹھری،، میں پہنچا [illegible] اور تنگ کمرے کا تقریباً ایک تہائی حصہ تو روسی صندوقوں سے بھرا ہوا ہے — ایک کونے میں ایک دوہری مسہری بچھی ہے، جس کے آگے [illegible] دار سوتی پردہ پڑا ہوا ہے۔ پلنگ پر بہت سے تکیوں کا ڈھیر ہے جن پر چمکدار سرخ غلاف چڑھے ہوئے ہیں، باقی جگہ میں ایک الماری، ایک میز، دو کرسیاں اور چھوٹی سی کھڑکی کے پاس ایک لکڑی کا بنچ — نیکفورچ یونیفارم کے [illegible] کے بٹن کھولے ہوئے بنچ پر بیٹھا ہے اور اس کی پیٹھ سے پوری کھڑکی چھپ گئی ہے — میں اس کے

سامنے سمٹ کے میز کے اس طرف، اس کی بیوی کے پاس بیٹھا ہوں۔ اس کی بیوی کی عمر کوئی بیس سال کی ہے، نوجوان عورت ہے، بھاری بھاری گول گول چہرہ سا، سرخ سرخ گال، نیلی مائل بھوری آنکھیں جن سے ایک عجیب قسم کی شرارت اور حماقت جھلکتی ہے۔ چمکتے ہوئے سرخ ہونٹ، مسکراہٹ سے مڑے ہوئے اور آواز میں خنکی کی جھلک۔

بونس والا کہتا ہے ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ میری ذرا سی بیٹی۔ سیکینیا —— تمہاری بکری کے آس پاس منڈلاتی رہتی ہے۔ آوارہ چھوکری ہے۔ لعنتی! ساری عورتیں لعنتی ہوتی ہیں——''

''سب عورتیں؟'' اس کی بیوی پوچھتی ہے۔

''ہر ایک——'' مکیفورج اس بات پر زور دیتا ہے اور میز پر لگے ہوئے چمچوں کو یوں جھنجھنا دیتا ہے جیسے کوئی گھبرا ہوا گھوڑا اپنا ساز جھنجھنا دے۔ ملٹری سے جانے کا ایک گھونٹ بھرتا ہے اور مزے مزے میں کہتا جاتا ہے:

''کسبی اور آوارہ، سڑک پر سونے والی رنڈی سے لے کر محل میں رہنے والی رانیوں تک۔ ملکہ سبا نے صحراؤں اور بیابانوں میں پندرہ سو میل کا سفر کیا تھا —— شاہ سلیمان سے ملنے کے لئے —— آوارگی کے ہی سلسلے میں تو —— اور ہماری زارینہ الیگزینڈرا بھی —— ویسے لوگ ان کو چاہے معظمہ کہیں لیکن...''

اور پھر وہ بڑی تفصیل کے ساتھ مجھ سے ایک معمولی نوکر کا قصہ بیان کرتا ہے جو ایک رات زارینہ کے ساتھ گزارنے کے بعد فوج کے تمام عہدوں کو پھلانگ کر معمولی سپاہی سے ایک دم جنرل ہو گیا۔ اس کی بیوی غور سے داستان سنتے ہوئے کبھی کبھی اپنے ہونٹ چاٹتی ہے اور میز کے نیچے سے میرے پاؤں میں اپنا پاؤں پھنسا دیتی ہے۔ مکیفورج بڑے ستھرے انداز میں برابر چٹخارے لے لے کر بات کرتا جاتا ہے۔ وہ یکایک گفتگو کا موضوع بدل دیتا ہے اور مجھے اس کا پتہ بھی نہیں چلتا:

''اب مثلاً ہماری ہی گلی میں ایک طالب علم رہتا ہے، یونیورسٹی کے پہلے سال میں ہے وہ — اس کا نام پلیتنیوف ہے —''

بیوی ٹھنڈی سانس بھر کر ٹکڑا لگاتی ہے:

''خوب صورت تو نہیں مگر اچھا ہے!''

''کون اچھا ہے؟'' نیکیفورچ نے پوچھا —

''مسٹر پلیتنیوف —''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ اس 'مسٹر' کے دم چھلے کو الگ کرو — مسٹر تو وہ جب بنے گا جب کچھ لکھ پڑھ لے گا — ابھی تو وہ معمولی طالب علم ہے جیسے سب طالب علم ہیں، ہزاروں — اور دوسری بات یہ ہے کہ 'اچھے' سے تمہارا کیا مطلب؟''

''وہ بہت خوش باش ہے، ہنستا ہنساتا رہتا ہے — اور پھر جوان بھی ہے —''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ سرکس کے مسخرے بھی ہنستے ہنساتے رہتے ہیں —''

''مسخرے! ان کی تو اور بات ہے — وہ تو تنخواہ ہی اس بات کی پاتے ہیں کہ ہنسیں اور ہنسائیں —''

''چپ رہو! اور دوسری بات یہ ہے کہ جوانی تو کتوں پر بھی آتی ہے — وہ بھی شروع میں پلے ہی ہوتے ہیں —''

'مسخرے — مسخرے تو بندر ہوتے ہیں خالی...''

''میں نے کہا چپ رہو — یاد نہیں رہتا! چپ رہو کہا تھا نا میں نے! سنتی ہے؟''

''ہاں ہاں سنتی ہوں —''

''ہاں، ہاں...''

اور اپنی بیوی کو اس طرح دبا کر خاموش کر کے، نکیفورچ مجھ سے مخاطب ہوتا ہے:

''یہ پلیتنیوف — جس کا میں ذکر کر رہا تھا نا — کافی دلچسپ آدمی ہے — تم کو چاہئے کہ اس سے میل جول بڑھاؤ —''

چونکہ نکیفوروچ نے اکثر مجھ کو اور پلیشوف کو ساتھ دیکھا ہوگا اس لئے میں جواب دیتا ہوں:

''میرا تو میل جول ہے اس سے۔''

''تو تمہاری ملاقات ہے؟ ہوں...''

اس کی آواز میں مایوسی محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنی مونچھ پر جلدی جلدی ہاتھ پھیرتا ہے اور اس کے نتھنے جھنجھناتے ہیں۔ میں تھوڑا محتاط رہتا ہوں کیونکہ مجھے ان ترجموں کا علم ہے جو سستیوف اپنے ہیکٹوگراف پر چھاپتا ہے۔

نکیفوروچ کی بیوی میری ٹانگ میں اپنی ٹانگ پھنسانے بڑے میاں کو اکساتی رہتی ہے اور وہ اکڑ اکڑ کر میرے سامنے اس طرح اپنے الفاظ کے خزانے کی نمائش کرتے رہتے ہیں جیسے مور اپنی دم کی۔ میں ٹھیک سے سن نہیں پا رہا ہوں کیونکہ اس کی بیوی میز کے نیچے اپنی ٹانگ سے برابر مجھ کو چھیڑ رہی ہے اور نکیفوروچ کی گفتگو کا زیادہ تر حصہ میرے ذہن سے نکل جاتا ہے۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس کی آواز کب مدھم اور بھاری لہجہ اختیار کر لیتی ہے۔

''دھاڑا! دھاڑا جو نظر نہیں آتا! سمجھے میاں،'' اور وہ گول گول آنکھیں پھاڑ کر مجھے گھورتا ہے جیسے ٹھٹک کر رہ گیا ہو۔ ''اور یہ عالی جاہ شہنشاہ کو مکڑی سمجھ لو...''

''اُنہہ! جانے کیا کچھ بک رہا ہے،'' اس کی بیوی چیخ کر کہتی ہے۔

''تم اپنی زبان بند رکھو احمق کہیں کی! میں سمجھانے کے لئے یہ مثال دے رہا ہوں۔ کوئی سچ مچ نہیں۔ چھمیا! کہیں کی، چل سماور ہٹا۔''

ابروؤں پر بل ڈال کر اور آنکھیں سکیڑ کر وہ بڑی شان سے اپنی بات جاری رکھتا ہے:

"ایک دھاگا جو دکھائی نہیں دیتا، مکڑی کے جالے کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ وہ شاہی محل شہنشاہ الیکسانڈر سوئم کے دل سے نکلتا ہے اور ان کے تمام عہدے داروں سے گزرتا ہوا مجھ تک پہنچتا ہے، بلکہ فوج کے افسر سے حقیر سپاہی تک بھی — یہ دھاگا ہر چیز کے گرد لپٹا ہوا ہے، لپیٹ رکھتا ہے اور اسی دھاگے کی طاقت سے —— اس طاقت سے جو نظر نہیں آتی —— زار کی حکومت اور اقتدار صدیوں سے قائم ہے — صرف وہ جو چالاک انگریز ملکہ ہے نا، اس نے پولیس والوں، یہودیوں اور کچھ روسیوں کو بھی رشوت دے دی ہے اور وہ بھی آزادی اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ جہاں سے پائیں وہاں سے اس دھاگے کو توڑ دیں اور ظاہر یہ کریں کہ عوام کے بڑے خیرخواہ ہیں —"

وہ میز پر سے ہوکر میری طرف جھکتا ہے اور بڑے سخت مگر دبے ہوئے لہجے میں آہستہ سے کہتا ہے:

"سمجھے؟ اچھا! تو پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ میں یہ سب باتیں کیوں کر رہا ہوں؟ تمہارا وہ نانبائی تمہاری بڑی چاپلوسی کرتا ہے کہ تم سمجھدار اور ذہین لڑکے ہو اور ایماندار ہو اور اکیلے رہتے ہو —— ٹھیک ہے — لیکن یہ تمام طالب علم تمہاری بیکری کے آس پاس منڈلایا کرتے ہیں — رات گئے تک ڈیرینکوو کے اندرونی کمروں میں گھسے بیٹھے رہتے ہیں — اگر کوئی ایک ہوتا تو سمجھ میں آتی یہ بات بھی لیکن اتنے بہتوں کے آنے جانے کا آخر مطلب کیا ہے؟ دیکھو، میں طالب علموں کی برائی نہیں کرتا — آج اگر انسان طالب علم ہے تو کل کو سرکاری وکیل بنے گا — طالب علم ہونا تو ٹھیک ہے لیکن ان لوگوں کو تو زندگی میں حصہ بٹانے کی اس قدر پڑی ہے کہ کیا کہیں جائے اور پھر زار کے دشمن ان کو اشتعال دلاتے ہیں — سمجھے؟ اور ایک بات تم سے اور کہوں....

لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ اور کہہ سکتا، دروازہ دھڑ

سے نکلا اور ایک بوڑھا آدمی داخل ہوا — مختصر سا جسم، سرخ ناک، سر کے گھونگھریلے بالوں کو چمڑے کے فیتے سے پیچھے کی طرف باندھے ہوئے — اس کے ہاتھ میں واڈکا کی بوتل تھی اور یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ تھوڑی سی اس کے پیٹ میں بھی پہنچ چکی ہے —

آتے ہی اس نے اکڑ کر بہکے انداز میں پوچھا:

''ڈرافٹ کی بازی ہو گی؟'' اور فوراً ایک کے بعد ایک مثلیں زور زور سے سنانے لگا۔ نیکیفورچ نے مرجھائے ہوئے، مرے ہوئے لہجے میں کہا:

''سب میرے سسر ہیں —'' اس کے بات کرنے کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کو سخت کوفت ہو رہی ہے —

اس کے بعد فوراً ہی میں نے اجازت چاہی۔ اس چلبلی عورت نے مجھے باہر پہنچاتے وقت میرے [illegible] اور بولی:

''دیکھو کیسے سرخ بادل چھائے ہوئے ہیں — آگ، بالکل آگ!'' — حالانکہ آسمان بالکل صاف تھا — صرف ایک طرف کو نارنجی رنگ کا ایک لکہ تیر رہا تھا —

میں اپنے استادوں کی بڑائی تو کیسا نہیں جتا سکتا، پھر بھی یہ ضرور کہوں گا کہ [illegible] کی منشن کا جسم [illegible] اس پولیس والے نے پہنچا، وہ ہمارے استاد نہیں پہنچا سکے [illegible] کہیں نہ کہیں کوئی مکڑی جیسی ہستی ہوتی اور اسی مکڑی کے وجود سے وہ دھاگہ نکلتا چلا آ رہا تھا جو نظر نہیں آتا تھا لیکن جو زندگی کو ہر پہلو سے باندھے اور لپیٹے ہوئے تھا — جا بجا بہت جلد مجھے یہ نظر آنے لگا کہ جدھر مڑتا ہوں، ادھر اسی دھاگے کے الجھاوے، پھندے، موڑ اور پیچ و خم موجود ہیں —

اس کے بعد جب دوکان بند ہو گئی اور کافی وقت گذر چکا تو دیرینکووا نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بڑی چستی سے مجھ

نے کہا کہ اس کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ میری اور پولیس والے کی گفتگو معلوم کرے — جب میں اس کو پوری رپورٹ دے چکا تو وہ ایک دم بول اٹھی:

''اے معبود!'' اور سر جھٹکتے ہوئے کمرے میں اس طرح چکر کاٹنے لگی جیسے چوہےدان میں بند چوہا — ''لیکن کبھی اس کمینی نے بھی ہم سے کچھ سمجھنے کی کوشش کی؟ وہ جو اس کی داشتہ ہے، نیکیفور کی کچھ رشتہ دار بھی تو لگتی ہے — کیوں ہے نا؟ ہم لوگوں کو اس شخص کو نکالنا ہی پڑے گا —''

میں دروازے میں کھڑا کھڑا بے دلی سے اسے دیکھ رہا تھا — 'داشتہ' کا لفظ اس نے بڑی سادگی کے ساتھ ادا کیا تھا جو نہ جانے کیوں مجھے پسند نہیں آیا — اس کا یہ خیال بھی مجھے اچھا نہیں لگا کہ نانبائی کو جواب دے دیا جائے —

''دیکھو تمہیں بہت ہوشیار رہنا چاہئے،'' اس نے کہا اور ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اس کے مستقل گھورنے سے مجھے سخت گھبراہٹ ہوئی — جیسے وہ نگاہیں مجھ سے کوئی سوال کر رہی ہوں اور وہ سوال کیا تھا، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا — اب وہ میرے سامنے کھڑی ہو گئی، ہاتھ کمر کے پیچھے تھے —

''تم ہمیشہ اس قدر بجھے بجھے کیوں رہتے ہو؟''

''ابھی ابھی میری نانی اماں کا انتقال ہوا ہے، بہت دن نہیں گذرے ہیں —''

ایسا معلوم ہوا کہ اسے یہ بات کچھ عجیب سی لگی اور دلچسپ بھی — مسکرا کر پوچھا:

''تم ان سے بہت محبت کرتے تھے؟''

''ہاں — اور کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟''

''نہیں —''

میں وہاں سے روانہ ہو گیا — اور اب جو ذہن پر زور ڈالتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ اس رات میں نے جو اشعار کہے ان میں بار بار یہ مصرع دوہرایا جاتا تھا:

''ہم جو ظاہر میں ہو باطن میں نہیں!''

اس واقعے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو مجھے طالب علم لوگ [illegible] سے ذرا الگ ہی رہیں اور نہ آئیں جائیں — اب چونکہ میری اور ان طالب علموں کی بہت کم ملاقات ہوتی تھی اس لئے وہ بہت باتیں جو میں کتابوں میں پڑھتا تھا لیکن ذہن میں صاف نہیں ہوتی تھیں، ان کے معنی کس سے پوچھتا؟ چنانچہ میں نے اپنے سوالات ایک نوٹ بک میں لکھنے شروع کر دیئے۔ لیکن ایک دن میں [illegible] ہو گیا — [illegible] نے میری تحریر پڑھ لی — اس نے مجھے جگایا اور پوچھا:

''یہ سب کس نے لکھا ہے تم نے؟ 'ذرہ بندی نے بادشاہ کو کیوں نکال باہر نہیں کیا، ذرہ بندی کون ہے؟ کیا بادشاہ کو نکال باہر کرنا ممکن ہے؟'''

اس نے کاپی غصے میں آ کے کونے میں پھینک دی اور [illegible] جا بیٹھا — وہاں بیٹھا بیٹھا مجھ پر بڑبڑاتا رہا:

''بادشاہوں کو — اور یہ [illegible] دیکھو [illegible] کی — عجیب بات ہے — اس طرح کے کرتب چھوڑو [illegible] یہ کتابیں دماغ پر چڑھ جاتی ہیں! چار پانچ سال ہوئے کہ [illegible] میں پولیس والے تمہارے ایسے کتنے لڑکوں کو ڈھونڈتے تھے، ہر طرف بلوں سے کھینچ کھینچ کر نکال رہے تھے [illegible] کی نگاہیں اب بھی [illegible] پر ہیں — بادشاہوں کو نکال باہر کرنا چھوڑو، بادشاہ کوئی کبوتر نہیں ہیں کہ تمہارے ایسے لونڈے ان کو ہشکار کے اڑا دیں گے —''

وہ میری خیر خواہی میں یہ سب لکھ رہا تھا لیکن مجھ سے یوں نہیں پڑ رہا تھا کہ اس کا خاطر خواہ جواب دے سکوں۔ مجھے منع کر دیا گیا تھا کہ ''خطرناک موضوعات'' پر کسی سے بات نہ کروں۔

شہر میں ایک خاص قسم کی شدت آئی ہوئی تھی جو ہمیں ساتھ لیے جا رہی تھی اور جس کی وجہ سے بڑا ہی ہنگامہ تھا۔ ہر جگہ لوگ ہیں جو بڑھ بڑھ کر آپس میں جھگڑ رہے ہیں اور بحث کر رہے ہیں۔ میں نے لاوروف سے درخواست کی کہ وہ جانوروں کا ڈاکٹر ہے کہ مجھے بھی وہ کتاب لا دے مگر اس نے مایوسی کے ساتھ سر ہلا کر کہا:

''نہیں۔ نہیں میرے دوست۔ اس کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ چند دنوں بعد ایک جگہ پر جس سے میں واقف ہوں، وہ بانٹی جائے گی۔ شاید میں تمہیں وہاں لے جا سکوں۔''

ازمپشن ڈے* کے دن میں آرسکوئے کے میدان میں سے ہوتا ہوا اندھیرے میں، لاوروف کے دھندلے خاکے کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ وہ مجھ سے تقریباً سو میٹر آگے تھا۔ میدان بالکل سنسان تھا۔ میں بھی لاوروف کی ہدایات کے مطابق تمام ''احتیاطوں'' پر عمل کر رہا تھا، بطور حفظ ماتقدم کبھی سیٹی بجاتا، کبھی گاتا اور کبھی کبھی لڑکھڑاتا جیسے شراب پیئے ہوئے مزدور ہو۔ سر پر چوڑے چوڑے سیاہ بادل آہستہ آہستہ تیرتے چلے جا رہے تھے۔ چاند سونے کی ایک گیند کی طرح ان بادلوں کے درمیان لڑھکتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے زمین پر گہری ترچھی پرچھائیاں پڑ رہی تھیں اور زمین پر جہاں جہاں روشنی کے دھبے تھے ان میں چاندی

---

* اس دن عیسائی مذہب کے عقیدے کے مطابق حضرت مریم جنت میں داخل ہوئی تھیں۔ (مترجم)

کی سی چمک پیدا ہو گئی تھی — میری پشت پر سے شہر کی جھنجھلائی ہوئی بھنبھناہٹ مسلسل سنائی دے رہی تھی —

مذہبی اکادمی سے بھی آگے، ایک باغ کی دیوار کے پاس، میرا رہبر سہم گیا — میں نے تیزی سے قدم بڑھائے اور اس سے جا ملا — دبے پاؤں ہم دونوں دیوار پر چڑھے اور باغ میں بڑھنے لگے جو لاپرواہی کی وجہ سے اجاڑ سا تھا اور اس میں تمام جنگلی گھاس اُگ آئی ہوئی — درختوں کی ڈالیں نیچے کو جھک آئی تھیں اور جب ہم ان میں سے گزرے تو شبنم کی موٹی موٹی بوندوں نے ہم پر بوچھار کی — ہم لوگ ایک مکان تک پہونچے اور کھڑکی پر ہلکے سے دستک دی جس کے پٹ بالکل بند تھے — کھڑکی دھیرے سے کھلی، ایک داڑھی والا چہرہ جھانکا — اس کے پیچھے بالکل اندھیرا اور مکمل خاموشی تھی —

آہستہ سے آواز آئی ”کون ہے؟“

”یاکوف کے دوست —“

”چڑھ آؤ —“

گھپ اندھیرے میں کچھ سوجھتا نہ تھا، پھر بھی مجھے اور لوگوں کی موجودگی کا احساس ہوا — لباس کی سرسراہٹ اور پیروں کی کھسر پھسر سنائی دی، دبی ہوئی ایک کھانسی، پھر پھس پھس باتیں — ماچس کا ایک شعلہ ابھرا، میرے چہرے پر روشنی پڑنے لگی اور میں نے ان تاریک سایوں سے بھرے دیواروں پر نظر دوڑائی —

”سب لوگ آ گئے؟“

”ہاں —“

”کھڑکی پر کچھ ٹانگ دو تاکہ روشنی چھن کر باہر نہ نکلے —“

ایک زوردار آواز نے غصے سے پوچھا:

”یہ کس کے دماغ کی لہر تھی کہ اس اجڑے ویران مکان میں اکٹھا ہوا جائے؟“

''ارے اتنے زور سے نہیں!''

دور کونے میں کسی نے ایک چھوٹا سا لیمپ جلایا — کمرہ بالکل خالی تھا، کسی قسم کا فرنیچر نہیں تھا — دو بکسوں پر تختہ [illegible] کے پانچ آدمی اس طرح سے تختے پر ایک دوسرے سے لگے بیٹھے تھے جیسے دیوار پر مینائیں — دوسرا بکس الٹا کر کے اس پر لیمپ رکھ دیا گیا تھا — تین اور آدمی دیوار کے پاس فرش پر بیٹھے تھے اور کھڑکی پر ایک نوجوان طوطے کی طرح اکڑوں بیٹھا تھا —— لمبے لمبے بال، نہایت دبلا، پیلی رنگت — اس نوجوان اور داڑھی والے آدمی کے علاوہ میں باقی تمام لوگوں کو جانتا تھا — داڑھی والے آدمی نے بھاری، گہری آواز میں اعلان کیا کہ وہ ہم لوگوں کو ایک کتابچہ پڑھ کر سنائے گا جس کا نام ''ہمارے اختلافات'' ہے — یہ کتابچہ گیورگی پلیخانوف کا لکھا ہوا ہے جو پہلے ''نارودنایا وولیا''* میں تھا —

فرش پر اندھیرے میں کوئی غرایا:

''ارے یہ سب ہم لوگ جانتے ہیں!''

اس پراسرار ماحول کی وجہ سے میرا مسرت بھرا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا جیسے یہ تمام باتیں ایک ولولہ انگیز شعر کی مانند ہوں — مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی سچے ایماندار کو اپنے کلیسا میں صبح کی عبادت کرنے کا اتفاق ہو رہا ہو — مجھے عیسائیوں کا شروع کا زمانہ یاد آ رہا ہے — وہ گہری، تھرتھراتی آواز ڈھلکی چلی جا رہی تھی، ہر لفظ صاف سنائی دے رہا تھا — اور وہ آواز کمرے بھر پر چھائی ہوئی تھی — پھر کسی نے ایک کونے سے کہا ''اونہہ، بے کار!''

---

* ایک خفیہ سوسائٹی جو زارشاہی کے خلاف انقلابی جد و جہد کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی — (ایڈیٹر)

اس کونے میں جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے ان کے سروں پر اس اندھیرے میں تانبے کی بڑی پراسرار سی چمک دکھائی دے رہی تھی — مجھے رومی سپاہیوں کے خود کا خیال آیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد سمجھ میں آیا کہ وہ دراصل سوور کی چمڑی تھی۔

بڑے زور اور جوش سے بحث اور تقریریں ہونے لگیں اور ان کے درمیان، آہستہ آہستہ مدھم مدھم آوازیں سنائی دینے لگیں جو اس جوش وخروش سے کچھ گھٹتا نہیں، یہاں تک کہ ایک مقرر اور دوسرے مقرر کی بات میں فرق کرنا ناممکن ہو گیا — پھر میرے سر کے بالکل اوپر کھڑکی پر سے کسی نے زور سے طنزیہ لہجے میں پوچھا:

''ارے ہم لوگوں کو وہ کتابچہ پڑھنا ہے کہ نہیں پڑھنا ہے؟،،

پڑھنے والا وہ زرد رو سنہرے بالوں والا لڑکا تھا — مدھم آوازیں رک گئیں اور پھر صرف پڑھنے والے کی بھاری، گہری آواز سنائی دینے لگی — جلتے ہوئے سگریٹوں کے سرے سرخ سرخ چمک رہے تھے، کبھی کبھار کسی دیا سلائی کا شعلہ لپکتا جس سے سوچتے ہوئے چہرے جھلک اٹھتے — چہرے جن میں آنکھیں غور و فکر سے سکڑ گئی تھیں یا پھیل کر بڑی ہو گئی تھیں اور گھور کر خلا میں تکتی جا رہی تھیں۔

کتابچے کی پڑھائی اتنی دیر تک جاری رہی کہ میں سنتے سنتے تھک گیا حالانکہ مجھے اس کے وہ تیز اور فکرانگیز الفاظ اچھے لگ رہے تھے جس کے ذریعہ قائل کر دینے والے معقول خیالات کو آسان اور سادہ زبان میں بیان کیا گیا تھا۔

غیر متوقع طور پر پڑھنے والا یکایک رک گیا — ایک دم سے کمرے میں غصے سے بھری ہوئی آوازیں گونجنے لگیں:

''غدار!،،

''صرف بات ہی بات!،،

"ہمارے دلیروں اور بہادروں کے خون کی مہک ہے یہ —"

"اس کے بعد 'لیبرانوف، اوننوف….'"

اور اس نوجوان نے کھڑکی پر بیٹھے بیٹھے پھر مضحکہ کیا:

"بھلے آدمیو! اگر ہم لوگ اس وقت ڈلی اور کوئلے ملتوی کرکے سنجیدہ بحث کریں تو کیسا رہے؟"

مجھے بحث پسند نہیں آ رہی تھی کیونکہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے اصل مطلب کیونکر نکالوں — جوشیلے خیالات کی بھٹکی ہوئی جست و خیز کا ساتھ دینا میرے بس کی بات نہ تھی — بور ہوتے اور بحث کرنے والوں کی شور اور آواز سے مجھے جھنجھلاہٹ اور کوفت ہونے لگتی تھی —

اس نوجوان نے کھڑکی پر بیٹھے بیٹھے نیچے جھک کر مجھ سے کہا:

"تم پیشکوف ہو نا؟ بیکری والا پیشکوف؟ مجھ کو فیدوسیئف کہتے ہیں — ہم دونوں کو دوستی کرنی چاہئے — دیکھو نا — اب یہاں تو ہم لوگوں کے لئے کچھ نہیں ہے — اب گھنٹوں تک یہ آوازیں یوں ہی چلتی رہیں گی اور ان سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا — تو، باہر چلیں — ہم دونوں، کیوں؟"

میں فیدوسیئف کے متعلق سن چکا تھا اور اس حلقے کے متعلق بھی جس کی تنظیم بھی اسی نے کی تھی اور جو نوجوانوں کا ایک نہایت سنجیدہ مزاج حلقہ تھا — مجھے اس کی نیلی آنکھیں اور زرد اعصابی، گھبرایا ہوا چہرہ بہت اچھا لگا —

جب ہم دونوں ساتھ ساتھ میدان سے ہوکر گزر رہے تھے تو وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا مزدوروں میں بھی میرے واقف کار ہیں، میں نے کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں، میرے پاس کتنا فالتو وقت تھا — اور باتوں کے علاوہ اس نے یہ بھی کہا:

"میں نے تمہاری اس بیکری کے متعلق بہت کچھ سنا ہے —

حیرت ہے کہ تم بھی اس حماقت میں مبتلا ہو۔ اس سے تمہیں کیا ملیگا؟"،

پچھلے چند دنوں سے مجھے خود بھی خیال ہونے لگا تھا کہ یہ سب بے کار ہے چنانچہ میں نے اس سے بھی اس خیال کا اظہار کیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ جدا ہوتے وقت اس نے بڑے خلوص سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور اس کے چہرے پر ایک روشن مسکراہٹ جھلک اٹھی۔ وہ ایک یا دو دن بعد تین ہفتے کے لئے شہر سے باہر جا رہا تھا۔ اور اس نے مجھ سے کہا کہ واپس آنے کے بعد وہ مجھے اطلاع دے گا کہ ہم لوگ کہاں اور کیسے مل سکتے ہیں۔

بیکری میں معاملات بہت اچھے چل رہے تھے لیکن میری رہی سہی دل چسپی بھی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ہم لوگ نئے مکان میں منتقل ہو گئے تھے اور میری مصروفیات اور بھی زیادہ ہو گئی تھیں۔ بیکری میں میرا جو کام تھا، اس کے علاوہ مجھے ٹوکریوں کے کونوں میں بھی خط اور کاغذ بھنچے ہوئے ملتے اور اکیڈمی ورکنگ میں صرف امیروں کی لڑکیوں کے ساتھ بھی بھیجے ہوئے ہوتے۔ میری ٹوکری سے لفافے وغیرہ نکال کر یہ نوجوان صاحبزادیاں محبت نامے اس میں گھسیڑ دیا کرتیں اور اکثر میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ نفیس خط کے کاغذ پر چھوٹے حروف میں نہایت بےحیائی کی باتیں لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ جب ان نوخیز چمکیلی آنکھوں والی لڑکیوں کا جھنڈ میری ٹوکری کے پاس اکٹھا ہوتا تو مجھے بڑا عجیب لگتا —— یہ لوگ ایک دوسرے کا منہ چڑاتیں، طرح طرح کی صورتیں بناتیں اور کھکھیاتیں اور اپنی گلابی ہتھیلیوں میں الٹی پلٹی جاتیں۔ میں انہیں غور سے دیکھتے ہوئے یہ سوچتا رہتا کہ ان میں سے کس نے وہ بےباک خطوط لکھے ہوں گے جن میں اتنے گندے اور ممنوع الفاظ تھے کہ ان کے صحیح معنی بھی شاید لکھنے والی نہ جانتی ہوگی۔ اور پھر میں گندے قحبہ خانوں کو یاد کر کے اپنے آپ سے پوچھتا:

''کیا یہ ممکن ہے کہ وہ دھاگا جو دکھائی نہیں دیتا، ان کوٹھریوں اور گندے کمروں سے یہاں تک بھی پہنچتا ہو؟''

ان صاحبزادیوں میں سے ایک نے مجھے ایک دن ہال میں روکا۔ اس کی چھاتیاں خوب ابھری ہوئی تھیں اور ماتھے پر خوب موٹی لٹ جھولتی لہرا رہی تھی۔ مجھ سے آہستہ سے بولی:

''اگر میرا یہ خط پہنچا دو گے تو میں تم کو دس کوپک دوں گی۔''

اس کی نرم سیاہ آنکھوں میں آنسو ابل آئے۔ ضبط کرنے کے لئے اس نے اپنا ہونٹ کاٹا اور اس کا چہرہ اور کان بالکل لال ہو گئے۔ میں نے نہایت مشفقانہ دلیری کے ساتھ پیسے لینے سے انکار کر دیا لیکن خط لے کر منزل مقصود پر پہنچا دیا — ایک لمبے سے طالب علم کو جس کے چہرے پر تپ دق کی سرخی تھی اور جو عدالت کے ایک جج کا بیٹا تھا۔ اس نے مجھے پچاس کوپک دینے چاہے۔ ان کو خاموشی سے گنا — سب ملا کے کوپک ہی کوپک تھے لیکن جب میں نے کہا کہ مجھے پیسے نہیں چاہئیں اور وہ ان کو جیب میں واپس رکھنے لگا تو اس کا ہاتھ اتنا کانپ رہا تھا کہ سکے کھنکھناتے ہوئے فرش پر گر پڑے۔ اور وہ خلا میں گھورتا، خاموش کھڑا ان کو فرش پر لڑھکتا دیکھتا رہا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ اس زور سے آپس میں ملے کہ انگلیاں چٹخ گئیں اور گہری ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگا:

''اب کیا کیا جائے؟ اچھا خدا حافظ، مجھے سوچنا پڑے گا...''

اس کی سوچ کا کیا نتیجہ نکلا یہ مجھے نہیں معلوم، لیکن اس دوشیزہ کے لئے میرا دل بہت غمگین ہوا۔ اس واقعے کے فوراً ہی بعد وہ کالج سے غائب ہو گئی۔ اور جب پندرہ سال بعد میری اس کی ملاقات پھر ہوئی تو وہ کریمیا میں ایک اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ اسے تپ دق تھی اور وہ دنیا کی ہر چیز کے متعلق ایک ایسے شدت کے تنفر

کے ساتھ بات کرتی تھی جو صرف ایسے انسان میں پایا جا سکتا ہے جسے زندگی نے سخت زخم لگائے ہوں۔

میں ہر جگہ نان اور کلچے بانٹنے کے بعد تھوڑی دیر سو جاتا تھا، پھر رات کو بیکری میں کام کرتا تاکہ آدھی رات تک تمام میٹھی چیزیں تیار ہو جائیں، کیونکہ ہماری یہ جگہ شہر کے تھیٹر کے پاس تھی اور کھیل ختم ہونے کے بعد لوگ دم بھر کو بڑے کلچے لینے دوڑ کر آتے تھے — اس کام کو ختم کر کے میں آٹا گوندھتا تھا اور خمیر تیار کرتا تھا اور بیس بیس پنسیری میدہ ہاتھ سے گوندھنا کوئی کھیل نہیں تھا — پھر دو تین گھنٹے سوتا اور اس کے بعد دوبارہ نان اور کلچے تقسیم کرنے نکل جاتا — اور اس طرح یہ کاروبار جاری رہتا — ایک کے بعد ایک دن گذرتے جاتے۔

اس تمام مصروفیت کے دوران مجھ پر ایک شدید جذبہ طاری رہتا تھا جو کسی طرح نہیں دبایا جا سکتا تھا — کہ میں جن چیزوں کو حقیقی، سچی اور آفاقی سمجھتا ہوں ان کے بیج بوؤں — میں فطرتاً ملنسار تھا اور خوش بیان — اور پھر میرے تخیل کو ذاتی تجربات اور کتابوں کے مطالعے نے اور بھی زیادہ اکسا دیا تھا — معمولی سے معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی بات سے میں دلچسپ قصے گڑھ لیا کرتا تھا اور ''اس دنیا کے متعلق جو دکھائی نہیں دیتی'' میں بڑی پیچ وخم اور رموز و اسرار والی چیزیں پیدا کر لیا کرتا تھا — کرسٹوفنکوف اور الافوزوف کی فیکٹریوں کے مزدوروں سے بھی اب میری جان پہچان بڑھ گئی تھی اور خاص طور پر ایک بوڑھا بنکر نکیتا روبتسوف مجھے بہت اچھا لگتا تھا — وہ ایک تیز، ذہین اور بے چین سماجی طبیعت والا آدمی تھا جس نے روس کی تقریباً ہر سوتی مل میں کسی نہ کسی وقت کام کیا تھا۔

''میں اس دنیا میں، اس زمین پر سات اوپر پچاس برس سے چل پھر رہا ہوں، میرے الکسئی مکسیمچ، میرا جوان بسولا، میری

سی ہوتی رکھائی!،، وہ بہت چھلکی ہوئی آواز میں کہتا۔ دنی عینک کے پیچھے سے بھوری آنکھوں میں جو ہمیشہ دکھی رہتی تھیں، ایک مسکراہٹ دکھائی دیتی — یہ عینک ہمیشہ تانبے کے تاروں سے اٹکی رہتی تھی اور ان تاروں کی وجہ سے اس کے ناک کے بانسے اور کانوں کے پیچھے ہمیشہ زنگ کے سبز نشان نظر آتے رہتے تھے — اپنے ساتھی مزدوروں میں وہ فیلسوف ''جرمن،، کہلاتا تھا کیونکہ وہ خط بنواتا تھا، مونچھیں منڈاتا تھا اور صرف نچلے لب کے نیچے سفید بالوں کا ایک سخت گچھا اور ایک چھوٹی سی سخت مونچھ چھوڑ دیتا تھا — اس کا قد درمیانہ تھا، سینہ چوڑا چکلا اور اس پر ایک عجیب اداس خوش دلی چھائی رہتی تھی —

اپنی چندیا صاف، گنجی کھوپڑی کو اتنا ٹیڑھا کرتا کہ وہ اس کے بائیں کندھے پر ٹک جاتی اور پھر کہتا ''مجھے سرکس پسند ہے — یہ لوگ کس طرح گھوڑوں کو سدھاتے ہیں — کیوں؟ آخر تو جانور ہی ٹھہرے نا وہ — بڑی تسلی ہوتی ہے — بڑے جانور اور انسان کو ان کا احترام کرنا پڑتا ہے — تو پھر میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ ضرور انسانوں کو بھی سدھانے کا کوئی طریقہ ہوگا کہ بنا دماغ استعمال کریں — ان جانوروں کو تو سرکس والے بتاشے کھلا کھلا کر، شکر کا مزہ چکھا کر قابو میں کرتے ہیں — لیکن ہم لوگ بنئے کے یہاں سے اپنی شکر خود ہی جو خرید سکتے ہیں — اصل میں ہم لوگوں کو ایک اور ہی قسم کی شکر کی ضرورت ہے جو روح کے لئے ہو —— اور اس شکر کا نام ہے مہر و محبت! اس لئے میں کہتا ہوں کہ سنو، معاملات کو سدھارنے کا طریقہ یہ ہے کہ مہربانی کرو، پیار سے کام لو، ڈنڈے سے نہیں جیسا کہ ہماری اس دنیا کا دستور ہے — ٹھیک ہے نا؟،،

لیکن وہ خود معاملات میں مہربانی سے کام نہیں لیتا تھا — اس کا لوگوں سے بات کرنے کا طریقہ طنزیہ اور حقارت آمیز تھا اور اگر

کوئی بحث چھڑ جاتی تو وہ مختصر فقرے برابر الٹ پلٹ کر کہے جاتا اور ہر فقرہ ہتک کرنے کے لئے ہوتا تھا — جب میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تو شرابخانے میں کچھ لوگ مشتعل ہو کر اسے پیٹنے پر آمادہ تھے — ایک دو دھول تو پڑ بھی چکے تھے — میں بیچ بچاؤ کرکے کسی طرح اسے باہر نکال لایا — جب ہم لوگ اندھیرے میں وہاں سے چلے تو خزاں کی ہلکی ہلکی پھوار کرنے لگی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا:

”کیا ان لوگوں نے اب تک زیادہ چوٹ تو نہیں پہنچائی!“

”تمہیں اس طرح چوٹ پہنچاتے ہیں؟ یہ لوگ چوٹ پہنچانا کیا جانیں“، اس نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا — ”سنو تم مجھ سے آپ جناب کیوں کرتے ہو؟“

اس طرح ہماری جان پہچان شروع ہوئی — شروع میں تو اس نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے میرا مذاق اڑایا لیکن جب میں نے اس کو بتایا کہ دنیا میں ایک ایسا دھندا ہے، جو دکھائی نہیں دیتا اور جس کا اہم اثر ہم سب کی زندگیوں پر پڑتا ہے تو اس نے کچھ سوچ کر کہا:

”ارے تم تو بیوقوف نہیں ہو، نہیں نہیں! جس طرح تم اس بات کو بیان کر رہے ہو اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تم بے وقوف نہیں ہو!“ پھر اس کا رویہ پدرانہ شفقت کا ہو گیا یہاں تک کہ وہ مجھے میرے اپنے نام اور والد کے نام سے پکارنے لگا —

”تمہارے خیالات صحیح خیالات ہیں، میرے الکسئی میکسیمچ، میرے لیے لڑکے سونے — وہ صحیح خیالات ہیں! بس یہی ہے کہ کوئی تمہارا یقین کرے گا نہیں — کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں...“

”مگر آپ تو میرا یقین کرتے ہیں نا؟“

”میں — میں تو ایک آوارہ کتا ہوں، بے گھر، بے در، اور

[illegible] نہ بھی نہیں ہوئی ہے — لیکن [illegible] لوگ [illegible] سے
ہیں اور ان کی دموں میں تمام گلستاں بھری ہوئی ہیں: سوسن، چمپے،
گل نرگس! اور ان میں ہر موجود نے اسے تولنے کی محبت میں مدہوش
ہے — وہ آنسوؤں سے رجعت کرنے لگے! ایک مدت ہم لوگوں نے خی
تک کاروبار شروع کیا تھا — مزدوروں کی مار میں — جو بھی سر
نہاں میں اس کے مر رہ رہی — اور بھی، [illegible] چوٹ ہو
ہے نہیں — جوٹ جیدی بھولے دن جبر بھی نہیں —''

لیکن جب اس کی ملاقات [illegible] نوف ماہیسنکوف سے ہوئی جو
[illegible] سکوف کی فیکٹری میں مستری تھا تب روبسوف ذرا مختلف
طریقے سے باتیں کرنے لگا — یہ سوف مذہبی [illegible] تھا، [illegible] خوب
جانتا تھا اور بائبل کے مضامین کا ماہر تھا۔ لیکن خدا کے وجود سے
اس شدت سے منکر تھا کہ روبسوف حیران رہ گیا — پیغمبروں کے جمے
ہوئے خون کے لوتھڑے [illegible] سے شوشے وہ [illegible] جوش وخروش سے
بحث کرتا:

''سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں خدا کی صورت اور سیرت
پر تخلیق نہیں کیا گیا ہوں — میں کچھ نہیں جانتا، کچھ کر
بھی نہیں سکتا، میں نیک دل بھی نہیں، نہیں، بالکل نیک دل نہیں!
دوسری بات یہ ہے کہ یا تو خدا کو اس کا علم ہی نہیں ہے کہ
زندگی مجھ سے کیسا برا برتاؤ کر رہی ہے یا پھر اس کو علم ہے
تو وہ کچھ کر نہیں سکتا یا کر سکتا ہے تو کرنا نہیں چاہتا — تیسری
بات یہ کہ خدا نہ تو عدل کی ہے، نہ قادر مطلق، نہ ہی رحمٰن الرحیم
وہ ہے ہی نہیں سرے سے! یہ سب من گھڑت باتیں ہیں، ہماری
پوری زندگی من گھڑت ہے، لیکن مجھ کو یہ بے وقوف نہیں بنا
سکتے!''

شروع میں تو ایسی باتیں سن کر حیرت کے مارے روبنسوف کی
بولتی بند ہو گئی — پھر غصے سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور وہ بے تحاشہ

دسال بجاتے رہے۔ لیکن باکوف نے انبر سے ہوائے دینے شروع کردیئے، اس کے پرشکوہ انداز کے سامنے روبسوف کو ہتھیار ڈالنا ہی پڑا اور وہ ایک گہری سوچ میں پڑ کر خاموش ہو گیا۔

ان خوشونتی بحثوں کے وقت باکوف نہایت ہی خوفناک ہستی ہو جاتا تھا۔ اس کے سانولے نقوش تانبے کے رنگ کے تھے، بال خانہ بدوشوں کی طرح بالکل سیاہ اور گھنگھریالے، نیچے سے ہونٹ چمکتے ہوئے بھیڑیوں کے سے دانتوں پر الٹے پڑے رہتے۔ وہ اپنے مخاطب کی طرف گھور کر دیکھتا تب تو اس کی سیاہ آنکھیں سر کی طرح سری سے چھیدتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں جیسے یہی زبردست جبلت سے سب کچھ ڈھا دیں گی۔ اس کی سکڑی ہوئی نظروں کو دیکھ کر مجھے وہ مجنوں یاد آجاتا تھا جسے اپنے معزز ہونے کا سودا تھا!

باکوف کے یہاں سے لوٹتے وقت روبسوف نے بڑی اداسی سے کہا:

''اس سے پہلے کبھی کسی نے خدا کی مخالفت میں مجھ سے باتیں نہیں کیں۔ ایسی باتیں تو میں نے کبھی سنی ہی نہیں۔ ویسے میں نے بہت سی باتیں سنی ہیں ۔۔۔ ہر قسم کی۔ مگر ایسی بات کبھی نہیں سنی ... کیسے افسوس کی بات ہے کہ ایسا شخص اور زیادہ دن زندہ نہیں رہے گا۔ دیکھو نا کس قدر جوش میں بھر گیا ہے کہ گرم ہو کر بالکل سفید پڑ گیا... مگر یہ کس قدر دلچسپ بات ہے۔ ہاں یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے۔''

روبسوف کو بہت جلد باکوف سے انس ہو گیا۔ دل کے مارے ہوئے اس مستری کی باتوں سے روبسوف میں ایک نیا جوش پیدا ہوا جیسے اس کے وجود میں، اندر ہی اندر، کسی چیز نے ابال کھانا شروع کردیا ہو۔ بار بار وہ ہتھیلیوں سے اپنی دکھتی ہوئی، سوجی ہوئی آنکھوں کو برابر ملتا رہتا۔

''تو پروردگار آؤٹ ہو گیا! ڈبہ گول ہوگیا اس کا! ہونہہ! اور اگر تو زار کی کہے نا، میری چمکیلی بلبل، تو بھئی میں تو یہ کہتا

ہوں کہ زار کی مجھے کچھ بھی فکر نہیں — زار میں کوئی حرج نہیں — وہاں سے تھوڑا ہی مصیبت شروع ہوتی ہے — آپ تو ہیں یہ مثالی لوگ — میں جس زار کے بھی ساتھ، کہو، ده چلا سکتا ہوں — چاہے وہ ایوان خوف ناک ہی کیوں نہ ہو — اور مجھے ذرا بھی فکر نہ ہوگی — ٹھیک ہے، بھئی، زار صاحب، آپ تخت پر بیٹھئے اور حکومت کیجئے اگر آپ اسی میں خوش ہیں — بس مجھے بھی اجازت دے دیجئے کہ ان مسئلوں کو جیسے میرا جی چاہے دماغ سیدھا کروں — اگر اس بات کی آپ مجھے اجازت دے دیں تو آپ کو سونے کی زنجیروں سے تخت میں باندھ کر آپ کی پرستش کروں....

کتاب ''ستہ بھوک'' پڑھنے کے بعد وہ بولا:

''ہاں، ایسا ہوتا ہے ہی، یہ تو بالکل ٹھیک ہے!''

جب اس نے پہلی مرتبہ ایک لیتھوگراف پر چھپا ہوا کتابچہ پڑھا تو پوچھنے لگا:

''یہ سب کس نے لکھ کر دیا ہے؟ کتنا صاف ہے سب کچھ! اس کے چھاپنے والوں سے میرا سلام کہنا، میرا شکریہ کہنا!''

روبتسوف کو معلومات حاصل کرنے کی ایسی پیاس تھی جو کبھی نہیں بجھتی تھی — وہ لوف کی لڑکھڑاتی، کانپتی، جوشیلی بحث کی ڈور کو برابر پکڑے رہتا اور ذہن پر زور دے کر اس پر مسلسل توجہ قائم رکھتا — میں اگر کتابوں کی بات کرتا تو وہ گھنٹوں میری گفتگو سنتا رہتا — خوش ہو ہو کر، سر کو پیچھے جھٹک کر ہنستا اور کہتا:

''انسان کا دماغ بھی کیا ہی تیز چیز ہے، کیا ہی زور دار، کیا ہی زبردست چیز ہے!''

دکھتی آنکھوں کی وجہ سے اس کے لئے پڑھنا تو مشکل ہوتا تھا لیکن وہ بہت سی باتیں جانتا تھا اور اکثر وہ ایسی ایسی معلومات بہم پہونچاتا کہ مجھ کو حیرت ہوتی — ایک دن کہنے لگا:

”تجربہ ہوا میں پلک جھپکتی تھی۔ اس کا دماغ نہایت غیرمعمولی ہے۔ بادشاہ تک اس کو بلا کر اس سے مشورے طلب کرتا ہے۔“

کچھ سوالات کرنے کے بعد یہ پتہ چلا کہ اس کی مراد یہیں سے تھی۔

”آپ کو اس شخص کے متعلق کس نے بتایا، کیسے پتہ چلا تمہیں؟“

”بس مجھے معلوم ہے“، اس نے اپنا گنجا سر کھجاتے ہوئے نہایت بھونڈے اختصار سے جواب دیا۔

باکوف زندگی کی محنت بھری لمبی کہانی میں اور گرجے میں کوئی حصہ نہیں لیتا تھا۔ وہ تو بس ہمہ تن پروردگار کی ذات کا مطالعہ کرنے پر مصر تھا، تلا ہوا تھا اور اسی میں غرق رہتا تھا۔ اس کے علاوہ پادریوں سے بھی اس کی کوئی نہیں تھی اور ان کو معزول کرنے کی کوشش بھی اس کا مشغلہ تھی۔ سب سے زیادہ وہ راہبوں سے نفرت کرتا تھا۔

ایک دن روتسوف نے اس سے بڑی نرمی سے پوچھا:

”باکوف، یہ کیا بات ہے کہ تم ہر وقت پروردگار کے ہی خلاف جھگڑا کرتے ہو اور کسی چیز کے خلاف نہیں؟“

اس بات پر باکوف غصہ سے بڑی زیادہ تلخی کے ساتھ چیخا:

”اچھا، تو اور کیا چیز ہے جو میرے راستے میں رکاوٹ بنی ٹھہری ہے؟ کیا چیز ہے سوائے اس کے؟ بیس سال میں نے اس پر ایمان رکھا، اس سے خوف کھایا، صبر کیا، کیونکہ شک کرنا، سوال کرنا منع ہے! جبکہ ہر بات کا وقوع اوپر آسمان کی مصلحت سے ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی زنجیروں میں جکڑ کر بسر کی۔ پھر میں نے انجیل پڑھی اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ سب من گھڑت ہے۔ سب من گھڑت ہے، نکیتا!“

پھر باکوف نے اپنا بازو ہوا میں گھمایا جیسے اس دھاگے کے دو

ہوں دوست چاہتا ہو جو دکھائی نہیں دیتا — پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنی بات جاری رکھی:

''اور اب میں اپنے وقت سے پہلے مر رہا ہوں ۔۔۔۔ اسی معبود سکے کورنا!،،

ان لوگوں کے علاوہ میرے اور بھی کئی دوست اور جان پہچان کے لوگ تھے اور سب ہی دلچسپ تھے۔ اکثر میں سمسوف کی بیکری میں اپنے پرانے دوستوں سے ملنے بھی جایا کرتا تھا — وہ لوگ ہمیشہ مجھے دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے اور جو باتیں میں کرتا اس کو دلچسپی سے سنتے — لیکن روسسوف جیونٹوں کے محلے میں رہتا تھا اور وہ لوگ ہماری محلے میں جو دریائے دہانے سے بھی بہت دور لگے تھے — کوئی چار میل کا چکر پڑتا تھا — اس لئے ان لوگوں سے ملاقات کم ہی ہوتی تھی — یہ سوال ہی نہیں اٹھتا تھا کہ مجھ سے ملنے آئیں — اول تو میرے پاس کوئی بیٹھک نہ تھی، ان کو بٹھاتا کہاں — پھر جو نیا بیکر مقرر ہوا تھا اس کی پولیس والوں سے دوستی تھی کیونکہ وہ پرانا سپاہی تھا — ہمارے احاطے کی حد پولیس کے ہیڈکوارٹر کے پچھواڑے سے ملی ہوئی تھی اور جارتی ''نیلے کوٹ،، دیوار پر سے پھاند پھاند کر کودا کرتے ۔۔۔۔ کبھی کمانڈنٹ کے لئے میدے کی سفید روٹی اور اپنے لئے آٹے کی بھوری روٹی خریدنے۔ اس کے علاوہ مجھے ہدایت بھی دی گئی تھی کہ زیادہ اپنے آپ کو ''ظاہر،، نہ کروں، ''روشنی،، میں نہ آؤں تاکہ ہماری بیکری پر زیادہ توجہ نہ ہونے لگے —

مجھے یہ نظر آ رہا تھا کہ میرا کام بے مقصد ہوتا چلا جا رہا تھا — لوگ روپئے کی دراز میں سے برابر روپیہ لیتے رہتے اور ذرا نہ سوچتے کہ پھر ہوگا کیا — بعض اوقات تو اس آزادی اور فراخ دلی سے روپیہ نکالا جاتا کہ میدہ کے دام ادا کرنے کو پھوٹی کوڑی نہ بچتی — دیربکوف بیچارہ مرجھائی، کھسیائی مسکراہٹ سے داڑھی کھینچتے ہوئے کہتا:

"ہم لوگوں کا دیوالہ نکلنے والا ہے۔"

دیربنکوف کے لئے زندگی بہت مشکل ہوتی جا رہی تھی۔ دستیا، جس کے سرخ مٹیالے سے بال تھے، پورے دنوں پیٹ سے تھی اور دیربنکوف کو دیکھ کر غراتی اور پھناتی ہوئی بلی کی طرح فوں فوں کرنے لگتی تھی۔ اس کی سبز آنکھیں اس طرح سب کو دیکھتی تھیں جیسے ساری دنیا اس کی مجرم ہو — وہ اس طرح اینڈتی دیربنکوف پر چڑھتی چلی جاتی جیسے اسے دیکھ ہی نہ رہی ہو — اور وہ مجرمانہ انداز میں ذرا سہما ہوا پہلے تو اس کے راستے سے ہٹ جاتا پھر جب وہ اندر جاتی تو اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہتا اور ٹھنڈی سانس بھرتا۔ کبھی کبھار وہ مجھ سے شکایت کے لہجے میں کہتا:

"یہ سارا معاملہ اس قدر ذلیلانہ ہے، اس قدر بچکانہ ہے کہ کیا کہوں! جس کے ہاتھ جو آتا ہے اٹھا لے جاتا ہے — آخر اس کی کیا تک ہے — میں نے اپنے لئے کچھ موزے خریدے، کوئی آدھی درجن ہوں گے، اور وہ اسی دن غائب ہو گئے!"

موزوں کی یہ کہانی تھی عجیب مضحکہ خیز تھی — لیکن میں ہنسا نہیں — میں برابر دیکھتا تھا کہ یہ بے غرض اور خاکسار انسان اپنے مفید کام کو جاری رکھنے کے لئے کتنی جدوجہد کر رہا ہے — اور میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ اس کے ارد گرد کے لوگ اس کے کام کے ساتھ کتنی بے پروائی کا سلوک کرتے تھے اور کتنی بے نیازی سے وہ اس کے کام کو درہم برہم کر رہے تھے۔ دیربنکوف جن لوگوں کی خدمت کرتا تھا ان سے وہ کسی صلہ کی توقع نہیں رکھتا لیکن کم از کم اس کو یہ حق تو تھا کہ جیسا برتاؤ اس کے ساتھ کیا جا رہا تھا اس سے زیادہ دوستانہ برتاؤ کیا جائے، اس کا آخر کچھ تو خیال کیا جائے — لیکن اس سے دوستانہ برتاؤ نہ کیا جاتا — اس کا خاندان بڑی تیزی سے ٹوٹ پھوٹ رہا تھا: اس کے باپ کو مذہبی خبط سے جب لگ گئی تھی — چھوٹے بھائی کو شراب اور رنڈی بازی

کی سی تھی — بھویں بالکل عورتوں کی طرح بے حد رعنی تھی — ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس رسیلے رنگ کے بالوں والے طالب علم کے ساتھ اس کا ناخوشگوار معاشقہ چل رہا تھا — اکثر مجھے نظر آتا تھا کہ اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سوج گئی ہیں اور میں اس طالب علم سے نفرت کرنے لگا تھا —

اس وقت میرا خیال تھا کہ مجھے ماریا دربنکووا سے محبت ہے — مجھے نادیزدا شچیرباتووا سے بھی محبت تھی جو ہماری دوکان میں مدد وغیرہ کیا کرتی تھی — گدبدی، سرخ گالوں والی لڑکی، بھرے بھرے ہونٹ، جو ہمیشہ ایک شفیق مسکراہٹ کی وجہ سے کھلے رہتے تھے — بات دراصل یہ تھی کہ میں فی الجملہ محبت کرنے کے موڈ میں مبتلا تھا — میری عمر، میرا کردار اور پھر میری الجھی ہوئی زندگی اس بات کا تقاضہ کرتی تھی کہ مجھے عورتوں کی محبت ملے — یہ ایک ضروری چیز تھی، ایسی ضرورت تھی جو وقت سے پہلے نہیں بلکہ ذہنی ضرر سے پیدا ہوئی تھی — مجھے عورت کے دل کی نرمی کی ضرورت تھی یا کم ازکم کوئی عورت مجھ میں دوستانہ دلچسپی ہی لینے لگتی — کسی ایسی ہستی کی ضرورت تھی جس سے میں بے جھجھک اپنے متعلق بات کر سکوں، جو مجھے اس سلسلے میں مدد دے سکے کہ میں اپنے بکھرے ہوئے خیالات کو، تاثرات کے بے پناہ انتشار کو جو میرے دل دماغ پر چھائے تھے، منظم کر سکوں —

میرے قریبی دوست نہیں تھے — میں ان لوگوں کی طرف مائل نہیں ہوتا تھا جو مجھے "کچا مال" سمجھتے تھے جس کی تربیت اور تہذیب کی جائے — ان سے کھلے دل سے بات چیت کرنے کو جی نہ چاہتا — اگر کبھی میں ان سے ان کی دلچسپی کے مخصوص موضوعات کے علاوہ کسی بات کے متعلق کچھ کہنا چاہتا تو وہ مجھے مختصر مشورہ دے دیتے:

"چھوڑو اس بات کو!"

کوری پلیتنوف گرفتار ہو گیا تھا اور پیٹرس برگ کے ''کریستی،، نامی قید خانے میں پہونچا دیا گیا تھا۔ سکیفوف نے مجھے یہ خبر سنائی جب علی الصبح گلی میں اس سے مڈبھیڑ ہوئی - فٹ پاتھ پر چلتا ہوا، اپنے تمام بٹن لگائے، وہ آہستہ آہستہ میری طرف آ رہا تھا جیسے ابھی پولیس سے واپس لوٹا ہو۔ لیکن اس کے چہرے پر فکرمندی کی چھاپ نہیں جھلکتی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل آئے، اس نے اپنی ٹوپی کی طرف ہاتھ اٹھایا اور ایک دم میرے پاس سے گذر گیا - پھر ٹھٹک کر رک گیا اور خشکی بھری آواز میں بولا:

''کل رات کوری گرفتار ہو گیا...،،

اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر بڑی مایوسی سے ہاتھ ملا کر مدھم آواز میں کہنے لگا:

''بیچارہ لڑکا! اب سمجھو ختم ہو گیا. برباد ہوا اب!،،

مجھے ایسا لگا کہ اس کی دھندلی آنکھوں کے کونے میں آنسو جیسی کوئی چیز چمک رہی تھی - سکیفوف کو گرفتاری کا خطرہ اور انتظار پہلے سے تھا - اس نے مجھے اس بات سے خبردار کر دیا تھا، مجھے مشورہ دیا تھا کہ اس سے الگ الگ رہوں اور یہ بھی کہا تھا کہ روشنوف کو بھی ہوشیار کر دوں کیونکہ روشنوف سے بھی وہ اتنی ہی محبت اور انس رکھتا تھا جتنا مجھ سے -

سکیفوف نے اپنی نظریں زمین پر گاڑے گاڑے بڑی بے دلی سے پوچھا:

''تم اب آتے کیوں نہیں؟،،

اس شام میں اس کے پاس گیا - وہ اپنے پلنگ پر بیٹھا تھا اور بس جاگ ہی رہا تھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے کھانس ہی رہا تھا - اس کی بیوی کھڑکی پر آلتی پالتی مارے بیٹھی، اس کی پتلون کی مرمت کر رہی تھی - اس نے سوچ میں ڈوبی نظروں سے مجھے دیکھا - پھر وہ سینے کے گھنے، روئیں جیسے بالوں کو کھجاتا ہوا بولا ''تو ہاں،

اسے ہوئی یہ بات کہ وہ لوگ اس کو گرفتار کرکے لے گئے — ان نے ایک [illegible] کی جس میں وہ [illegible] زار کے خلاف پرچیاں چھاپنے کے لئے —"

پھر اس نے [illegible] پر ٹھوکر، اپنی بیوی کو [illegible]:

"لاؤ دو پتلون!"

اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا "ابھی ایک منٹ میں —"

بڑے میاں نے اس کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرکے مجھے سمجھایا "اسے اس کا بہت غم ہے — سارے دن روتی رہی! غم تو مجھے بھی ہے لیکن تم ہی سوچو کہ ایک طالب علم آخر زار کی طاقت کے خلاف کیا کر سکتا ہے؟"

پھر اس نے کپڑے پہنے اور کہا:

"میں ابھی آتا ہوں اور تم... تم ذرا سماوور گرم کرو —"

اس کی بیوی خاموشی سے بے حس و حرکت بیٹھی کھڑکی سے باہر گلی میں گھورے جا رہی تھی، لیکن جب دروازہ بند ہو گیا تو اس نے جلدی گھوم کر اسے گھونسہ دکھایا اور دانت پیس کر بڑی جلن اور بغض کے ساتھ کہنے لگی:

"منحوس بڈھا شیطان کہیں کا! [illegible] ہے اس کی ذات پر!"

اس کا چہرہ روتے روتے سوج گیا تھا، بائیں آنکھ پر سیاہ رنگ کا نیل پڑا ہوا تھا جس سے آنکھ تقریباً بند ہو گئی تھی۔ اٹھ کر وہ سماوور کے پاس گئی اور سماوور پر جھک کر غصے سے پھنپھناتی ہوئی فوں فوں کرنے لگی:

"دیکھنا اس کو کیسی دغا دیتی ہوں — ہاں — ایسی دغا دوں گی کہ چیختا پھرے گا جیسے بھیڑیے رات میں چیختے پھرتے ہیں — تم اس کی بات کا ہرگز اعتبار نہ کرنا — ایک لفظ کا بھروسہ نہ کرنا — یہ تمہیں بھی پھانسنے کی فکر میں ہے — وہ جھوٹ بکتا ہے — وہ کسی پر ترس نہیں کھاتا — تمہارے بارے میں اس کی

سب کچھ معلوم ہے — اسی پر یہ زندہ رہتا ہے! انسان کا شکاری کمبخت!"

وہ میرے قریب آ گئی اور اس طرح مجھ سے مخاطب ہوئی جیسے کوئی بھکاری بھیک مانگے: "کیا تم مجھے گلے نہیں لگا سکتے؟ کیوں؟"

یہ عورت مجھے بری لگی تھی لیکن جس ایک آنکھ سے اس نے میری طرف دیکھا اس میں کچھ ایسا درد، ایسا دکھ جھلک رہا تھا کہ میں نے اسے لپٹا لیا اور اس کے الجھے بالوں کو سہلانے لگا۔ اس کے بال موٹے اور کھردرے تھے اور چکناہٹ ان میں بسی ہوئی۔

"اب یہ کس کو تاکے ہوئے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رستوریدیکا کے بورڈنگ ہاؤس میں کچھ لوگ رہتے ہیں۔ ان پر نگاہ ہے اس کی۔"

"کیا نام ہیں ان کے؟"

اس نے مسکرا کر جواب دیا:

"اور جو بات تم مجھ سے پوچھ رہے ہو اگر میں اس کو بتا دوں تو... دیکھو دیکھو، آ ہی گیا — اسی کمبخت نے بیچارے گوری کو شکار کیا..."

اور وہ جھٹ سے میرے پہلو سے نکل کر تندور کے پاس پہنچ گئی۔

نیکیفورچ روٹی، جام اور وادکا لایا — ہم لوگ چائے پینے بیٹھے — مارتنا نے میرے پاس بیٹھ کر مجھے خاص دوستانہ عنایت کے ساتھ چیزیں پیش کیں اور اپنی ایک اچھی والی آنکھ سے، بڑی محبت سے مجھے جھانکتی جاتی، اس کا شوہر مجھے خیرخواہی سے نصیحت کرتا جاتا:

"وہ لوگوں کے دلوں کے اندر سمایا ہوا ہے، ہڈیوں تک میں پیوست ہے — وہ دھاگا جو دکھائی نہیں دیتا — بھلا اسے کھینچ

نکیے کی، جڑ سے توڑنے کی کوشش تو کر کے دیکھو— اور لوگوں کے لئے وہی اہمیت رکھتا ہے جو خدا رکھتا ہے —''

یکایک اس نے پوچھا:

''اب تم کتابوں کے متعلق اتنا جانتے ہو— انجیل میں جو کچھ لکھا ہے تمہارے خیال میں وہ سب ٹھیک ہے، اس؟''

''پتہ نہیں —''

''میرا تو خیال ہے کہ اس میں بے ضرورت چیزیں بھی لکھی ہیں — اور وہ بھی کافی تعداد میں! مبارک ہیں غریب! بھلا غریبی میں مبارک ہونے کی کیا بات ہے؟ یہ بات ذرا بڑی سے اوپری ہوئی معلوم ہوتی ہے اور غریبوں کا جو معاملہ دیکھو تو بہت سی باتیں ایسی ہیں جو دماغ میں واضح اور صاف ہی نہیں ہیں — ان میں بھی فرق ہوتا ہے —— مثلاً کچھ غریب ایسے ہیں جو ہیں ہی غریب یا پھر ایسے ہیں جو غریب کر دئیے گئے ہیں — اگر کوئی غریب ہے تو وہ آخر کس کام آ سکتا ہے — لیکن جو غریب ہو گیا ہے تو ہو سکتا ہے، وقتی بدنصیبی ہو اس کی — تو اگر اس طرح سوچا جائے تو زیادہ ٹھیک ہے —''

''کیوں؟''

وہ ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گیا، متجسس نگاہوں سے مجھے تکنے لگا اور پھر بات شروع کی —— بہت ہی صاف اور کھلے ڈھنگ سے —— اور ظاہر تھا یہ باتیں بہت ہی سوچی ساچی ہوئی ہیں —

''انجیل میں رحم حد سے زیادہ ہے اور ترس کھانا نہایت خطرناک بات ہے — کم از کم میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں — ترس کھانے کے یہ معنی ہیں کہ روپئے کی بہت بڑی مقدار کو لے کر لوگوں پر صرف کیا جائے جو خطرناک بھی ہو سکتے ہیں — خیرات خانے، بید خانے، پاگل خانے! ہونا یہ چاہئے کہ صرف مضبوط اور تندر-

لوگوں کی مدد کی جانے تاکہ ان کی قوت بے کار نہ جائے — لیکن نہیں ۔ ۔ ہم لوگ تو کمزوروں، مریضوں کی مدد کرتے ہیں کیونکہ کمزور کو بھی طاقتور بنایا جا سکتا ہے ۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مضبوط لوگ اپنی طاقت کھو بیٹھتے ہیں اور کمزور انسان ان کی گردن پر سوار ہو جاتے ہیں ۔ یہ ہے مسئلہ مشکل! ہم لوگوں کو یہ اچھی طرح اپنی کھوپڑی میں ٹھونس لینا چاہئے کہ دنیا نے ابتدا سے الگ ایک راہ اختیار کی تھی ۔ مدت ہوئے وہ ان چیزوں سے الگ ہو چکی ہے اور اسی راہ پر چل رہی ہے ۔ اب اس بدنصیب کو ہی لو سمجھو! اس کا خیال ہے کہ وہ کیوں گرفتار ہوا؟ صرف ترس کھانے کی وجہ سے ۔ ہم لوگ فقیروں کو بھیک دیتے ہیں لیکن طالب علموں کی کوئی مدد نہیں کرتے، ان کو یوں ہی چھوڑ دیتے ہیں ۔ اس میں آخر کیا منطق ہے؟''

میں اس شخص کے خیالات سے پہلے بھی دو چار ہو چکا تھا لیکن اتنی شدت سے نہیں ۔ عام طور پر لوگ جیسا سمجھتے ہیں اس سے کہیں زیادہ یہ خیالات پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی جڑیں لوگوں کے ذہنوں میں گہری ہیں ۔ اس کے تقریباً سات سال بعد جب مجھے نیٹشے کی کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا تب مجھے قازان کے اس پولس والے کا فلسفہ بالکل یاد آ گیا ۔ اور چلتے چلتے یہ بھی کہہ دوں کہ میں نے بعد میں کتنی ہی کتابوں میں ایسے خیالات پائے ہیں جن سے میں حقیقی اور روزانہ کی زندگی میں دوچار نہ ہوا ہوں ۔

''انسان کی شکرگزاری،، وہ کچھ باتیں کرتا رہا، کرتا رہا ۔ وہ باتوں کے ساتھ ساتھ چائے کی کشتی پر انگلیوں سے تال دیتا جا رہا تھا ۔ اس کے دبلے پتلے چہرے پر سخت سخت بل تھے لیکن چہرہ میری طرف نہیں مڑا ہوا تھا بلکہ پیتل کے منجھے ہوئے چمکدار سماور کے آئینے کو برابر گھورے جا رہا تھا ۔

اس کی بیوی نے اسے دو مرتبہ یاد دلایا ''ارے تمہیں جانا

ہے۔۔۔ تمھارے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔۔۔" چلو میں چلتا ہوں۔ کوئی رکاوٹ ڈالے بغیر وہ نئے خیالات کے دھارے میں ایک کے بعد ایک بہاؤ میں رواں رہتا — اس کی گفتگو اسی طرح ایک ہی انداز میں چل رہی تھی اور کہیں سے بھی ایسی ہوتی نہیں نظر آتی تھی کہ جب تک اس میں ایک نئی شاخ پھوٹی:

"تم بے وقوف اور بدھو ہو کے تو نہیں ہو، پڑھے لکھے بھی ہو — کیا نوکری کا یہ کام تمھارے لئے موزوں ہے؟ مناسب ہے؟ اتنا ہی پیسہ یا اس سے زیادہ بھی نہ کما سکتے اگر یہ زار کی حکومت کے لئے کوئی اور کام کرتے....

میں اس کی بات سن رہا تھا لیکن میرا دھیان اس مسئلہ کی طرف لگا تھا کہ ان لوگوں کو جو سیوروپاولسک کے ورکنگ ہاؤس میں رہتے تھے، کس طرح ہوشیار کروں — میں ان لوگوں کو جانتا بھی نہیں تھا اور نکیفوروچ ان کے پیچھے لگا ہوا ہے — اس ورکنگ ہاؤس میں ایک شخص رہتا تھا جس کا نام سرگئی یوسوف تھا۔ وہ ابھی حال ہی میں ساؤوروفسک میں جلا وطنی کے دن کاٹ کر لوٹا تھا — میں نے اس کے متعلق بہت سی باتیں سنی تھیں — دلچسپ باتیں!

"دشمن لوگوں کو چاہئے کہ جتھہ بندی کر کے رہیں جیسے شہد کی مکھیاں چھتے میں رہتی ہیں! زار کی سلطنت...."

اس کی بیوی بولی "تھوڑی سو دیکھو — نو تو بج بھی گئے ہیں —"

"غضب ہے!" کہہ کے نکیفوروچ اچھلا اور جلدی جلدی اپنی وردی کے بٹن بند کرنے لگا — "اچھا، اچھا خیر — تھوڑا دیری کر ہوں گا — خدا حافظ بھائی میرے، آیا کرو، شرمانے کی ضرورت نہیں...."

آج جب میں اس کے گھر سے نکلا تو اپنے دل میں قطعی فیصلہ کر چکا تھا کہ اب نکیفوروچ کے یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔

یہ بڈھا تھا تو دلچسپ مگر نہایت قابلِ نفرت، اس نے جو باتیں کی تھیں کہ رحم دلی کے بدولت کیا کیا نقصانات ہوئے ہیں ان سے میرا ذہن کافی الجھ گیا تھا اور پریشانی سی ہو رہی تھی، اس کے الفاظ جیسے ذہن میں چپک کر رہ گئے تھے کہ کسی طرح بھولتے ہی نہ تھے — مجھے ان میں تھوڑی سی حقیقت ضرور نظر آئی لیکن مجھے افسوس اس کا تھا کہ اس حقیقت کے رخ سے پردہ ہٹانے والا ایک پولیس کا آدمی تھا —

اس موضوع پر اکثر بحثیں بھی ہوا کرتی تھیں اور اس طرح کے ایک مباحثے نے تو خاص طور پر میرے دل دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا —

بات یہ ہوئی کہ شہر میں ایک ''ٹالسٹائی وادی،، وارد ہوا — پہلا ''ٹالسٹائی وادی،، جس سے میری مڈبھیڑ ہوئی — اس کا قد لمبا تھا، ہڈیاں چوڑی اور ٹیڑھی میڑھی، زرد رنگ، بکرے کی سی سیاہ داڑھی اور حبشیوں کے سے موٹے ہونٹ — اس کا قد کسی قدر جھکا ہوا تھا چنانچہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین کو گھورے جا رہا ہے — لیکن وہ باربار ایک دم تیزی سے اپنے نیم گنجے سر کو پیچھے کی طرف جھٹکتا اور اس کی سیاہ تابناک آنکھوں سے پھوٹتی ہوئی جوشیلی نگاہوں کی چمک دل کے پار اترتی چلی جاتی — لیکن اس کی ان چبھ جانے والی نظروں میں سے نفرت کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں — یونیورسٹی کے پروفیسروں میں سے ایک کے گھر پر مباحثہ ہوا — بہت سے نوجوان اکٹھے ہوئے —— ان میں ایک دبلا پتلا پادری بھی تھا جو مذہبیات کی اعلیٰ سند حاصل کر چکا تھا — سیاہ رسمی جبہ پہنے جس سے اس کے تیکھے نقوش پر چھائی ہوئی زردی بہت اچھی طرح کھل رہی تھی — بھوری، سرد آنکھوں میں ایک اداس، ٹھنڈی مسکراہٹ کی روشنی تھی —

ٹالسٹائی وادی نے تفصیل کے ساتھ ان حقیقتوں اور سچائیوں

کا بیان کیا جو انجیل میں پائی جاتی ہیں اور ان کی دوامی قوت اور اہمیت پر زور دیا۔ اس کی آواز بے جان تھی، جملے چھوٹے چھوٹے اور کٹے پھٹے لیکن الفاظ زوردار طریقے سے گونجتے تھے اور ان اسلوب سے مختصر اعتقاد کی قوت سننے والوں تک پہونچتی تھی۔ بار بار اس کا روشنی سے بھرا ہوا بازو گھومتا ہوا اس کے جسم کے اوپر سے نیچے تک آتا تھا جیسے کسی چیز کے ٹکڑے کاٹ رہا ہو —— ٹھیک اسی طرح ہر بار۔ دوسرا ہاتھ جیب میں تھا۔

‘‘جیسے تھیٹر کا ایکٹر’’، کسی نے میرے پاس ہی کونے میں سے آہستہ سے کہا۔

‘‘ہاں بے حد تھیٹر قسم کا ہے...’’

اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے میں نے ایک کتاب پڑھی تھی —— جہاں تک میرا خیال ہے غالباً ڈریپر کی —— جس میں سائنس کے خلاف کیتھولک مذہب کی جد و جہد بیان کی گئی تھی۔ اور تالستائی وادی بھی مجھے ان ہی لوگوں کی قسم کا ایک آدمی لگتا تھا جو محبت کی طاقت کے ذریعہ دنیا کو نجات دلانے میں بڑی شدت سے یقین رکھتے ہیں لیکن جن کے ایمان کی شدت اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ اسی شدت میں وہ اپنے ہم جنس انسانوں کو آگ میں بھی جھونک دینے کو تیار ہیں۔

وہ سفید قمیص پہنے ہوئے تھا، چوڑی چوڑی آستینیں اور اس کے اوپر سے ایک پرانی، بھورے رنگ کی عبا۔ اس لباس کی وجہ سے بھی وہ کمرے میں بیٹھے ہوئے باقی لوگوں سے مختلف لگ رہا تھا۔ اپنا وعظ ختم کرنے کے بعد اس نے باآواز بلند کہا:

‘‘چنانچہ میں پوچھتا ہوں: آپ حضرت عیسےٰ کے پیرو ہیں یا ڈارون کے؟’’

یہ سوال پتھر کی طرح کمرے کے اس کونے میں گرا جہاں نوجوان طبقہ ایک دوسرے سے چپکا ہوا بیٹھا تھا —— وہ کونہ جہاں

نوجوان مردوں اور عورتوں، دونوں کی بھی آنکھوں میں جوش اور ہراس کے شعلے ایک وقت لپک رہے تھے — ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تالستانی وادی کی تقریر پر سب ششدر رہ گئے ہیں — سوچ میں سر جھکائے ہوئے ہے اور کوئی نہیں بول پا رہا تھا — تالستانی وادی نے گھوم کر مجمع پر نگاہیں دوڑائیں اور زور سے بولا:

''ان دو ادیبوں کا کبھی میل نہیں ہو سکتا اور صرف وہ لوگ ان دو متضاد چیزوں کو ملا سکتے ہیں جو فریسی ہوں — اور اسی [illegible] میں وہ اصفہانی سرمایہ دار خود فریبی اور جھوٹ میں مبتلا ہیں اور [illegible] کو بھی اپنے ساتھ اس لعنت میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں……''

حبیب ہاذری اپنی جگہ سے اٹھا، بڑے سلیقے سے اس نے اپنے جبہ کی آستین سمیٹی، اس طرح مسکرایا جیسے سب کو بڑی ہمدردی [illegible] رہا ہے [illegible] کے ساتھ تقریر کرنی شروع کی اور بڑی نرمی کے ساتھ [illegible] الفاظ استعمال کرنے لگا — ''یہ واضح ہو گیا کہ جناب عالی بھی فریسیوں کے متعلق اس عام رائے پر یقین رکھتے ہیں جو نہ صرف جاہلانہ اور کمزوری ہے بلکہ سرے سے غلط بھی ہے……''

اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ دلیل پر دلیل دیتا گیا کہ فریسیوں کو یہودیوں کی شریعت کا سچا اور وفادار محافظ سمجھنا چاہئے، کہ عوام نے ہمیشہ اپنے دشمنوں کے خلاف فریسیوں کا ساتھ دیا ہے — ''مثلاً جوزیفس فلیوس کی لکھی ہوئی چیزیں پڑھئے……''

تالستانی وادی اچھل پڑا اور فلوس کو ہاتھ کے ایک اشارے سے ٹال کر الگ کیا جیسے اسے تلوار سے ایک ہاتھ مار کر قتل کر دیا ہو، اور پھر چیخا:

''آج بھی عوام اپنے دوستوں کے مقابلے میں اپنے دشمنوں کا ساتھ دینے لگتے ہیں — عوام اپنی مرضی سے کام نہیں کرتے، ان کو ہنکا

جاتا ہے، اس پر رحمدلی کی جاتی ہے — تمہارے فیوس سے مجھ سے کوئی مطلب نہیں — مجھ سے اس سے کیا واسطہ؟''

اس پادری اور دوسرے بحث کرنے والوں نے بنیادی سوالات کو اس قدر چھیڑا کہ پرزے پرزے ہو گئے اور اصل موضوع بحث ہی میں غائب ہو گیا۔

''محبت — حقیقت ہے''، تالستانی وادی نے جوش سے کہا اور اس کی آنکھیں نفرت اور حقارت سے چمک اٹھیں —

مجھے ان الفاظ سے نشہ سا چڑھنے لگا یہاں تک کہ ان کے معنی بھی اب میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے — ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیروں کی زمین ڈانوا ڈول ہو رہی ہے اور میں الفاظ کے بگولوں میں لپٹا ہوا گرد باد کی طرح چکرا رہا ہوں — بار بار مجھے یہ سوچ کر سخت مایوسی ہوتی کہ دنیا میں کوئی ایسا احمق اور غبی نہ ہوگا جیسا کہ میں ہوں!

اس تالستانی وادی نے اپنے سرخ چہرے پر سے پسینہ پونچھا اور زور زور سے چیخنے لگا:

''ایک طرف ہٹاؤ انجیل کو! بھول جاؤ اس کو، تب تم جھوٹ نہیں بولو گے! عیسیٰ کو ایک بار پھر صلیب پر چڑھا دو — تو زیادہ ایمانداری ہوگی!''

اندھی دیوار کی طرح ایک سوال میرے سامنے اٹھ کھڑا ہوا — یہ سب کیا ہے؟ اگر اس دنیا میں مسرت کے لئے مسلسل جدوجہد کا ہی نام زندگی ہے تو کیا رحمدلی اور محبت اس جدوجہد کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتے؟

میں نے اس تالستانی وادی کا نام دریافت کیا — کلوبسکی — اور یہ کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا تھا — دوسرے دن شام کو میں اس سے ملنے گیا — وہ دو نوجوان لڑکیوں کا مہمان تھا جو زمیندار تھیں — میں اس سے ملنے گیا تو باغ میں ایک پرانے لائم کے گھنے

درخت کے سائے میں میز اور کرسیاں پڑی تھیں اور وہیں وہ ان دونوں لڑکیوں کے ساتھ بیٹھا تھا ۔ دبلا پتلا، ٹیڑھا پکلا، نوکیں سی ادھر ادھر نکلی ہوئی، سفید لباس پہنے، کھلی ہوئی قمیص کے گلے کے پاس سے پختہ رنگ کا، بالوں سے بھرا ہوا سینہ دکھائی دیتا ہوا ــــ اس کا حلیہ بالکل ایسا تھا جیسا میرے خیال میں ایک قلندر پادری کا ہونا چاہئے جو حق کی تبلیغ کرتا ہو ۔

اس کے سامنے ایک پیالہ رکھا ہوا تھا جس میں رس بھریاں اور دودھ ملا ہوا تھا اور وہ ایک چاندی کا چمچہ اس میں ڈبو ڈبو کر، مزے لے لے کر کھاتا اور اپنے موٹے ہونٹ چاٹ جا رہا تھا ۔ ہر چمچے کے بعد وہ دودھ کے سفید قطروں کو پھونک مار مار کر اپنی ننھی سی مونچھ پر سے اڑا دیتا ۔ بہنوں میں سے ایک اس کے پاس کھڑی اسے کھلا رہی تھی اور دوسری، دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، آنکھیں میچے ہوئے گرد آلود آسمان پر جمائے، درخت سے لگی کھڑی تھی ۔ دونوں لڑکیاں ایک ہی سے بدرنگ، گلابی رنگ کے لباس پہنے تھیں اور دونوں کی صورتیں بھی آپس میں اس قدر ملتی جلتی تھیں کہ فرق کرنا مشکل تھا ۔

تالستائی وادی بڑی توجہ اور مہربانی سے مجھ سے باتیں کرتے رہے ــــ محبت کی تخلیقی قوتوں کے متعلق، کہ کس طرح انسان اپنی روح میں ایسے عشق کی توفیق پیدا کر سکتا ہے کیونکہ یہی وہ قوت ہے جو ''کائنات کی روح کے ساتھ انسان کا تعلق،، پیدا کر سکتی ہے ۔ اس عشق سے آدمی کا ناتہ جوڑ سکتی ہے جو زندگی میں حلول ہے ۔

''صرف ان چیزوں سے انسان عشق پیدا کر سکتا ہے ۔ بغیر محبت کے زندگی کو سمجھنا ناممکن ہے ۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ زندگی کا قانون ہے جدوجہد ــــ ان کے دل اندھے ہیں، ان کی تباہی یقینی ہے ۔ آگ سے آگ نہیں بجھائی جا سکتی اور اسی طرح بدی سے بدی کا علاج نہیں کیا جا سکتا ۔،،

لیکن بعد کو جب وہ دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے، باغ سے جڑی ہوئی مکان کی طرف چلی گئیں تو اس آدمی نے آنکھیں سکیڑ کر ان کو دور تک دیکھنے کے بعد مجھ سے پوچھا:

''تم ہو کون؟''

جب میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا تو سبز سبز آنکھوں سے شعلے جھڑتے ہوئے بات کرنے لگا کہ انسان ہر جگہ ہر حال میں انسان ہے اور اس طرح آدمی کو اپنی دنیاوی حیثیت بدلنے کے بجائے اپنی روح کی تربیت کرنی چاہئے کہ وہ بنی‌نوع انسان سے محبت کر سکے—

''انسان جتنا ہی دنیاوی حیثیت سے نیچے ہوتا ہے اتنا ہی وہ زندگی کی حقیقی صداقتوں اور اس کے مقدس علم و دانش سے قریب ہوتا ہے...''

گو کہ مجھے اس بات میں شک تھا کہ ''علم و دانش'' سے خود اس کو کتنی واقفیت ہوگی لیکن میں کچھ بولا نہیں— مجھے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اکتایا ہوا تھا— اس کی نگاہوں نے مجھے روک دیا۔ پھر اس نے ایک جھرجھری لی، دونوں ہاتھ باندھ کر سر کے پیچھے جمائے اور مونچھوں کو جھٹکنے سے جھلاتے ہوئے اس طرح بڑبڑایا جیسے نیند میں ہو:

''عشق کے آگے مہر ڈال دو... یہی زندگی کا قانون ہے...''

پھر یکایک اچھلا، ہاتھ پھیلا دئیے، ہوا میں جیسے کسی چیز کو ٹٹولا، پھر چوکنا ہو کر میری طرف دیکھا:

''یہ کیا ہے؟ معاف کرنا مگر میں بہت تھکا ہوا ہوں!''

اور آنکھیں بند کر کے دانتوں کو باہر نکال کر زور سے بھینچا جیسے کسی درد کو ضبط کر رہا ہو— نچلا ہونٹ لٹک گیا اور اوپر والا کھنچ کر تبی مائل چھوٹی سی مونچھ سے مل گیا، مونچھ کے بال کھڑے ہو گئے—

میں واپس ہوا تو ذہن میں اس کی طرف سے ایک غصے کا احساس تھا اور اس کی سچائی اور خلوص پر مبہم مبہم سا شک ہو گیا تھا۔

چند دن بعد میں یونیورسٹی کے ایک جانے پہچانے معلم کے یہاں علی الصباح کیسے پہنچ گیا — یہ معلم کنوارا ہے اور شرابی — تو وہاں کنوسکی سے میری دوسری بار مڈبھیڑ ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات بھر سویا نہیں ہے، چہرہ پر چڑھا ہوا تھا، نتھنے سرخ اور سوجے ہوئے تھے — مجھے شک ہوا کہ وہ ابھی شراب کے نشے میں دھت ہے — یونیورسٹی کا موٹا معلم، ناک بہتے ہوئے، صرف جانگیہ پہنے، گویا غاشیہ میں تھے، فرش پر پسینہ تھا — اس کے چاروں طرف تمام فرنیچر بکھرا پڑا تھا — کپڑے ادھر ادھر پڑے ہوئے تھے اور بستر کی طرف بوتلیں لڑھک رہی تھیں — وہ جھوم جھوم کر ہنس ہنس کر کہے جا رہا تھا:

’’ز... رحم کیجئے...‘‘

کنوسکی غصے میں زور زور سے چیخ رہا تھا:

’’وحشی تہذیب نے ہمیں کھایا ہے، ہم لوگ یا تو عشق میں کھو جاتے ہیں یا عشق کے لئے جدوجہد کرتے کرتے مر جاتے ہیں — دونوں طرح سے ہماری موت ہے...‘‘

اس نے میرے کندھے پکڑ لئے اور مجھے اس یونیورسٹی کے معلم کے پاس کھینچ لے گیا۔

’’یہ لو — اس سے پوچھو یہ کیا چاہتا ہے، پوچھو اس سے — یہ بنی نوع انسان سے محبت کرنا چاہتا ہے کہ نہیں...‘‘

اس معلم نے آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور ہنسنے لگا:

’’ارے یہ... یہ تو وہ ہے — وہ بکری والا... اس کے پیسے نکلتے ہیں مجھ پر...‘‘

لڑکھڑاتے اور جھومتے ہوئے اس نے جیب میں ایک ہاتھ ڈالا اور کنجی نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

"لو، جو کچھ میرے پاس ہو سب لے لو!"

لیکن اس مسیحی والدی نے جھٹ سے کنجی جھپٹ لی اور مجھے ہاتھ سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔

"لو، چلو، تمہارے پیسے پھر مل جائیں گے۔"

میرے لائے ہوئے سکے اس نے کونے میں رکھے ہوئے صندوق میں پھینک دئیے۔

اس نے مجھے پہچانا نہیں اور مجھے اس بات سے خوشی ہوئی۔ میرے ذہن پر اس کی بات چپکی رہ گئی کہ محبت ہی سے ہماری کمبختی آ جاتی ہے — اور میرے دل میں اس کے لئے انتہائی کراہیت کا جذبہ ابھر آیا تھا۔

اس کے فوراً ہی بعد میں نے سنا کہ اس نے ان لڑکیوں میں سے ایک سے اظہار عشق کیا جن کے گھر وہ ٹھہرا ہوا تھا اور اسی دن دوسری بہن سے بھی اسی طرح کا اظہار کر گیا — دونوں بہنوں نے آپس میں ایک دوسرے سے اپنے دل کی بات کہہ دی اور ان کی خوشی نفرت میں بدل گئی — اس شخص کے خلاف ان کے دل میں سخت نفرت اور غصے کا جذبہ پیدا ہوا — انہوں نے دربان کو بھیجا کہ عشق کے اس تبلیغ کرنے والے سے تشریف لے جانے کی درخواست کرے — چنانچہ وہ حضرت شہر سے اڑنچھو ہو گئے۔

عشق اور رحمدلی اور یہ کہ زندگی میں ان چیزوں کا کیا مقام ہے — یہ ایک مشکل اور الجھا دینے والا سوال ہے اور شروع ہی سے میرے سامنے درپیش رہا ہے — پہلے تو یہ معاملہ بھوتوں و ارواح کی بے معنی کے ایک ٹھہرے احساس کی صورت میں سامنے آتا رہا لیکن بعد میں اس کی ایک مبہم تعریف کے بعد پھر ایک صاف اور واضح سوال میرے سامنے آیا کہ محبت آخر کیا ہے؟

میں نے جب مطالعہ کیا اس سب میں عیسائی مذہب کے اصول و خیالات اور انسان دوستی کی اشک بھری درخواستیں تھیں کہ

نبی نوع انسان سے رحم دلی اور نیکی سے پیش آیا جائے — اس دوران میں میں جتنے بہترین مردوں اور عورتوں سے ملا، ان کی زبانوں نے بھی جوشیلے زورِ بیان کے ساتھ ان ہی خیالات کا اظہار کیا تھا — لیکن میں روزانہ کی زندگی میں جو کچھ دیکھتا تھا اس کی تمام تفصیلیں، نیکی اور رحم دلی کے ان خیالات سے بالکل متضاد تھیں! زندگی نے میرے سامنے دشمنوں اور بے رحمیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ پیش کیا تھا جس میں مختلف طرح کی حقیر چیزوں کی ملکیت حاصل کرنے کے لئے نہایت ہی بھونڈے قسم کی چھینا جھپٹی بے روک ٹوک جاری رہتی تھی — جہاں تک میرا سوال تھا مجھے صرف کتابوں کی خواہش تھی — دوسری چیزیں میرے لئے کوئی قیمت نہیں رکھتی تھیں —

اگر مجھے صرف ایک گھنٹہ بھی گھر سے باہر پھاٹک پر جانے کو مل جاتا تو یہ صاف نظر آ جاتا تھا کہ یہ تمام لوگ — نوجوان، مزدور، دربان، کسان، سوداگر، دوکاندار — اپنی زندگیاں مجھ سے بالکل مختلف طریقے پر بسر کرتے تھے — صرف مجھ ہی سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے بھی مختلف طریقے پر جن کو میں پسند کرتا تھا — وہ لوگ کچھ اور ہی آرزوؤں کے سہارے جیتے تھے، ان کے مقصد بالکل الگ تھے — اور وہ لوگ جن کا میں احترام کرتا تھا جن پر مجھے اعتماد تھا وہ عجیب و غریب طریقے سے لوگوں کے لئے بالکل اجنبی تھے، بالکل تنہا تھے — انسانوں کے کثیر جمِ غفیر میں ان کی حالت پردیسی غریب الوطنوں کی سی تھی کہ جنھیں کوئی اپنا نہ سمجھتا تھا — مختلف لڑنے والے انسانوں کے درمیان پھنسے ہوئے جو کسی نہ کسی طرح گھٹیا قسم کی جوڑ توڑ اور چالاکیاں کرکے اس بیوقوف کے بل کو قائم رکھنا چاہتے تھے جسے وہ زندگی کہتے تھے — میرے نزدیک یہ گھٹیا زندگی حماقت ہی حماقت تھی کیونکہ اس سے جس طرح زہر پھوٹتا تھا اور اکثر مجھے یہ نظر آتا تھا کہ جو لوگ محبت اور رحم دلی کی باتیں کرتے تھے وہ زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھتے تھے —

جہاں عمل کا سوال آتا تھا وہ بھی لاشعوری طور پر زندگی کے عام دھارے کے بہاؤ کے آگے ہتھیار ڈال دیتے تھے۔

یہ سارا معاملہ بڑا مشکل، بہت ہی دشوار تھا!

ایک دن لاوروف نے ہانپتے ہوئے کہا:

''ظلم یہاں تک بڑھنا چاہئے کہ لوگ ہر جگہ اس سے عاجز آجائیں، یہاں تک کہ دنیا میں ہر متنفس اس سے نفرت کرنے لگے جیسے اس مکروہ خزاں کے موسم سے لوگ نفرت کرتے ہیں۔'' لاوروف جانوروں کا ڈاکٹر تھا اور اسے جلندر کی بیماری تھی جس کی وجہ سے وہ سوج کر پیلا پڑ گیا تھا۔

اس سال خزاں جلد آ گئی تھی — بارش ہو رہی تھی اور سردی بڑی شدید تھی — نتیجہ یہ تھا کہ بیماریاں خوب پھیل رہی تھیں — خودکشیاں عام ہو گئی تھیں — لاوروف نے بھی آخر خودکشی ہی کی — اس نے پوٹاشیم سنائیڈ کھا لیا اور اس بات کا انتظار نہیں کیا کہ جلندر کی بیماری اس کا گلا گھونٹ ڈالے —

''مویشیوں کا ڈاکٹر! جانوروں کا تو علاج کرتا ہے اور اپنے آپ جانوروں کی طرح مر گیا،'' سیدنیکوف درزی نے کہا — لاوروف اسی کے یہاں رہتا اور کھاتا تھا — سیدنیکوف ویسے بڑا مذہبی اور متقی آدمی تھا جو معبود کی ماں کے متعلق ہر گیت میں شامل ہو سکتا تھا کیونکہ اسے ساری مناجاتیں یاد تھیں — وہ اپنے بچوں کو باقاعدگی سے روز پیٹتا تھا — ایک سات برس کی لڑکی اور ایک گیارہ برس کا لڑکا — اس کام کے لئے وہ چمڑے کی ایک بھری چابک استعمال کرتا تھا — اپنی بیوی کی پنڈلیوں پر وہ بانس کی لاٹھی سے مارتا تھا — اکثر شکایت کرتا:

''مجسٹریٹ صاحب نے مجھ کو ڈانٹا پھٹکارا — کہنے لگے میں نے یہ طریقہ چینیوں سے سیکھا اور میں نے اپنی زندگی میں کسی چینی کو دیکھا تک نہیں ہے — ہاں تصویروں میں ضرور دیکھے ہیں اور دوکانوں کے تختوں پر بھی —''

سدنیکوف کی دوکان میں ایک اور درزی کام کرتا تھا ـــ روکھا سا، ٹیڑھی ٹانگوں ـــ سب اس کو "دونکا کی ماں" کہتے تھے ـــ وہ اپنے مالک کے متعلق کہتا:

"یہ نیک اور مسکین لوگ! اور اوپر سے مذہبی! ان ہی سے تو ڈرنا چاہئے ـــ جھگڑنے یا ہنگامہ کرنے والوں کو تو انسان فوراً سمجھ جاتا ہے کہ کیا ہیں اور جیسے بچنے کی مہلت بھی مل جاتی ہے لیکن یہ مسکین لوگ ـــ ایسے دبے پاؤں رینگتے ہوئے آتے ہیں، چالاکی سے، چھپکے چھپکے، جیسے گھاس میں چھپا ہوا سانپ اور قبل اس کے کہ آپ کو پتہ چلے بس آپ کو ڈس لیا جاتا ہے، ٹھیک اسی جگہ سے جہاں آپ کا دل سب سے زیادہ کھلا ہوا ہو۔ ـــ میں تو بھئی اس طرح کے لوگوں سے بہت ڈرتا ہوں ـــ مسکینوں سے، پرہیزگاروں سے......"

ویسے "دونکا کی ماں" خود بھی بہت مسکین اور چالاک قسم کا تھا اور ہر وقت سدنیکوف سے ادھر ادھر کی جڑا کرتا تھا ـــ اسی لئے وہ سدنیکوف کو عزیز بھی تھا لیکن جو بات اس نے کہی وہ بالکل صحیح تھی ـــ

بعض وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسکین لوگ زندگی کے سخت، جناتی دل و بدن ان آئے تھے جیسے پتھر پر کائی لگ جاتی ہے ـــ وہ اس پتھر کے رنگ کو مدھم کر دیتے ہیں، اسے زیادہ نرم اور زرخیز کر دیتے ہیں، پھر بھی اکثر جب میں اس چیز کی زیادتی دیکھتا، یہ دیکھتا کہ کس طرح وہ کمینے پن پر اتر آتے ہیں اور جب ان کی پھسپھسی طبیعت، روح کی لچک اور ڈھلمل پن کو دیکھتا اور ان کی کمزور پستی، رونی، تن تن تن سنتا ـــ تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میں ایک گھوڑا ہوں جیسے بہت سی مکھیوں کے نرغے میں جکڑ کر باندھ دیا گیا ہے ـــ

جب میں اس پولیس والے کے کمرے سے اپنے گھر کی طرف لوٹا تو یہ سب خیالات میرے دماغ میں بھرے ہوئے تھے ـــ ہوا آہس

بھڑ بھڑ کر چل رہی تھی جس سے سڑک کے چراغوں کی لو بھڑک بھڑک اٹھتی تھی اور اس کی وجہ سے ایسا لگتا تھا جیسے تاریک سرمئی آسمان کانپ کانپ اٹھتا ہو اور ہر کپکپی کے ساتھ انگور کی مٹھی بھر رس کی سی بارش چھن کر گر پڑی تھی — ایک بھیگی ہوئی اندھی سڑک پر چلی آرہی تھی، ایک آدمی کو کھینچتی، گھسیٹتی، جھٹکے دیتی — وہ آدمی جیسے تیسے کرتا جا رہا تھا اور لڑکھڑاتے گیا چلا جا رہا تھا — عورت تھکی ہوئی بے جان آواز میں کہہ رہی تھی:

''ارے یہ تو قسمت ہے، تقدیر ہے...''

اور میں نے سوچا ''یہ بات ہے! یہی تو مصیبت میرے ساتھ بھی ہے — مجھے بھی تو گھسیٹا جا رہا ہے — دھکے دے دے کر مجھے بھی ایسے مکروہ گڑھوں میں دھکیلا جا رہا ہے جہاں بدی ہی ہے، لعنت ہے اور اس طرح کے مرد عورتیں ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں — اور میں بالکل تھک گئی ہوں —''

الفاظ بالکل یہی تو شاید نہ رہے ہوں لیکن خیالات غالباً طور پر ایسے ہی تھے جو اس اداس شام کو میرے ذہن میں چکر کاٹ رہے تھے — اس وقت پہلی مرتبہ مجھے اپنی روح کی تھکن کا احساس ہوا، اس کراہتی بیچارگی کا احساس ہوا جو میرے دل کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی اور اس وقت سے میری ذہنی کیفیت بدلنے لگی — میں اپنے آپ کو اجنبی نظروں سے دیکھنے لگی، گھبرائی ہوئی سی اپنا جائزہ لینے لگی —— مرد آنکھوں سے، اجنبی آنکھوں سے، دشمن کی نظروں سے!

ہرسو ہر انسانی روح کے اندر مجھے تضادات کی ایک خاردار اور منتشر سطح نظر آنے لگی۔ تضاد جو نہ صرف الفاظ اور عمل سے متعلق تھے بلکہ جذبات سے بھی — اور ان جذبات کا زہر رہ رہ کر متعدد مجھے خاص کر پریشان کیا کرتا — اپنی روح میں بھی مجھے یہ کہیں نظر آتا تھا اور یہ سب سے بڑھ کر متعجب تھی — ہر چہار طرف میری

طبیعت کھنچی تھی: عورتوں اور کتابوں کی طرف، محنت کش مزدوروں اور کھلنڈرے ہنستے کھیلتے طالب علموں کی طرف لیکن وقت نہیں ملتا تھا کہ ان رجحانات میں سے کسی ایک کو بھی مطمئن کر سکوں۔ ایک چیز سے دوسری کی طرف میں اس طرح چکر کھاتا ہوا بھٹکتا پھرتا تھا جیسے کوئی سجا ہوا لٹو۔ کوئی انجانا ہاتھ جو نظر نہیں آتا تھا مگر نہایت قوی تھا جیسے مجھے ایک ان دیکھی چابک مارتا ہوا آگے کو ہنکا رہا تھا۔

مجھے معلوم ہوا تھا کہ یاکوف شاپوشنیکوف کو ہسپتال لے جایا گیا تھا، اس لئے میں اس سے ملنے وہاں گیا۔ لیکن ایک موٹی سی عورت منہ بسورے، عینک چڑھائے، سر پر سفید رومال مرجھائے ہوئے سرخ ہوتے کانوں کے پیچھے باندھے آئی اور مجھ سے بڑی بے نیازی سے بولی:

"وہ مر گیا!"

جب میں یہ جواب سن کر نہیں گیا بلکہ وہیں اس کا راستہ روکے کھڑا رہا تو اس کو غصہ آ گیا۔ چڑ چڑا کر پوچھنے لگی:

"کیوں؟ اور کیا چاہئے؟"

پھر مجھے بھی غصہ آ گیا:

"تم گدھی ہو — احمق!"

"نکولائی، آنا — ذرا اس کو نکال باہر کرنا!"

نکولائی کچھ تانبے کی سلاخوں کو ایک جھاڑن سے چمکا رہا تھا۔ غرّا کے اس نے میری گردن پر ایک سخت رسید کر دی۔ اس پر میں نے اس کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور دروازے کے باہر لے جا کر ہسپتال کی سیڑھیوں کے بیچ کیچڑ کے ایک چہبچے میں بٹھا دیا۔ ایک دو منٹ تو وہ اسی جگہ بیٹھا مجھے حیران نظروں سے تکتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا:

"اخ، کتے کا پلا!"

میں وہاں سے نکل کر درزاوین پارک میں گیا اور وہاں شاعر کے بت کے نیچے لگے ہوئے بنچ پر بیٹھ گیا — میرے دل میں ایک آگ سی لگی تھی کہ کوئی مکروہ حرکت کروں، کوئی ذلیل بات کروں تا کہ لوگوں کے جتھے کے جتھے مجھ پر ٹوٹ پڑیں اور اس بات ہونے کی بدولت مجھے یہ حق حاصل ہو جائے کہ میں جواباً ان کو ماروں — لیکن چھٹی کا دن ہونے کے باوجود پارک میں اور اس پاس کی گلیوں میں کوئی متنفس تک نظر نہ آتا تھا — صرف ہوا جھکورے دے لے کر، [illegible] ہوئی پیڑوں کو ہلاتی ہوئی چل رہی تھی — قریب کے ایک لیمپ پوسٹ پر چپکے ہوئے کسی اشتہار کا ایک کونہ جو بورڈ سے چھوٹ گیا تھا، ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا —

جھٹپٹے کا وقت تھا، ہوا میں خنکی آتی جا رہی تھی اور آسمان پر گہری نیلی سیاہی بڑھتی آ رہی تھی — میرے سامنے شاعر کا مجسمہ ایک تانبے کے بت کی طرح لگ رہا تھا — میں اس کی طرف گھور کے دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا کہ ایک انسان اس دنیا میں رہتا تھا — [illegible] جس کی روح آتشیں اور معصوم تھی اور وہ اس روح کی شورش کے سبب معتوب ہے [illegible] — لیکن وہ انسان میں ہوں [illegible] بالکل معمولی قسم کا ہے! یہ کس قدر عجیب بات ہے، لیکن ساتھ ہی ناقابل برداشت!

اور وہ بکواس کس قدر لغو اور بیہودہ ہے — اس کو چاہئے تھا کہ مجھ سے لڑتا یا پولیس کو بلوا کر مجھے حوالات میں بھیج دیتا —

میں روسسوف سے ملنے گیا اور دیکھا کہ وہ اپنی کوٹھڑی میں میز کے پاس جھکا بیٹھا ہے — میز پر ایک ننھا سا چراغ جل رہا تھا اور وہ اس کی روشنی میں اپنی صدری کی مرمت کر رہا تھا —

''! خوب مرمت…'' میں نے آہستہ سے کہا —

بڈھے آدمی نے اپنا [illegible] ہیں۔ وہ ابھی تک سوئی پکڑے ہوئے تھا۔ [illegible] ہے کہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنانے کے

لیے اس نے یوں ایک دم سے ہاتھ اٹھایا تھا — لیکن پھر رک گیا — دھاگہ کسی چیز میں الجھ گیا اور بہت آہستہ سے اس نے ماں کی گالی دی —

کچھ دیر بعد بڑبڑایا:

''ویسے تو ہم سب کو ہی ایک نہ ایک دن مرنا ہی ہے — لیکن لوگوں کی موت کیا ہی بری عادت ہے! ہاں یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے کہ لوگ — تو وہ مر گئے صاحب۔ اور یہاں کسی کے نکڑ پر ایک سینما رہتا تھا وہ بھی تو چلا گیا — مجھے اتوار کو — سوا دس اس کو لے گئی تھی — لوری نے مجھے اس سے ملایا تھا — بس اس کو جتنا تھا اس سینما کو — ہوشیار آدمی تھا اور طالب علموں کا دوست — یہ طالب علم کچھ گڑگڑاتے ہوئے ہیں، تم نے کچھ کیا؟ تو ذرا یہ حکمت سی دو — مجھے تو کچھ سوجھ ہی نہیں رہا ہے ..''

اس نے اپنے چیتھڑے اور سوئی دھاگہ میرے حوالے کر دیا اور خود کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا ہاتھ پیچھے باندھے ہوئے، تیز تیز کھانس کے پھڈاتا ہوا:

''کبھی یہاں، کبھی وہاں ایک شعلہ سا لپکتا ہے اور پھر شیطان اسے پھونک مار کر بجھا دیتا ہے اور پھر وہی ویرانہ کی ہیبت دوڑ شروع ہو جاتی ہے — یہ کمبخت شہر بڑا منحوس ہے — درندے جیسے اور کشتیاں رکنے سے پہلے بھیا میں تو یہاں سے چلا جاؤں گا —''

پھر وہ رک گیا اور اپنی گنجی کھوپڑی کھجاتے ہوئے جیسے مجھ سے پوچھنے لگا:

''مگر کہاں جاؤں گا؟ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں میں نہ گیا ہوں — ہاں میں نے بہت سفر کیا ہے اور اپنے آپ کو تھکا دیا ہے —''

پھر تھوک کر بولا:

''زندگی! لعنت ہے اس پر! زندہ رہو، کام کرو، محنت کرو اور پھر کچھ حاصل نہیں — نہ جسم کو، نہ روح کو...''

سونے میں چپ چاپ کھڑا ہو کر وہ اس طرح دل ہلاتے رہا جیسے موجود نہیں رہا ہے — پھر تیزی سے کمرے کو پار کرکے میز پر میرے پاس بیٹھ گیا —

''میں یہ کہتا ہوں، الکسئی میرے — لیتے جاؤ دو قسموں کی باتیں [illegible] نے [illegible] بڑا اور فراخ دل [illegible] کی ذات کے جوڑنے میں ختم کرو — خدا تب کسی کی حالت سدھر سکتا ہے، یہ زمین سدھر سکتی ہے ورنہ ان دونوں کے وجود سے اندر کرنے سے ہماری حالت سدھر سکتی ہے — اصلی بات یہ ہے کہ عوام کو خود اپنے لئے بھلا کہنا چاہئے، اپنی جانب سے تبھی مطمئن ہونا چاہئے — وہ جو یہ بری ہوئی بدحال زندگی بسر کر رہے ہیں اس زندگی سے یکسر انکار کر دینا چاہئے — یہ بات ہے! میں تو بوڑھا آدمی ہوں — تجربہ کر بھی نہیں پاتا — بہت دن نہیں گذریں گے کہ نپٹ اندھا ہو جاؤں گا — یہ بہت ہی بری بات ہے بھیا — بری لگتی ہے — جیکٹ ختم کر لی؟ شکریہ... آؤ چلو شراب خانے میں چلیں — چائے پی لی جائے تھوڑی سی...''

شراب خانے کو جاتے وقت میرے کندھے کا سہارا لئے ٹھوکریں کھاتا چل رہا تھا — اس کی بات جاری تھی:

''بری بات گرہ سے باندھ رکھو — عوام کا یہ صبر، یہ برداشت کسی نہ کسی دن ختم ہوگی، ضرور ختم ہو جائے گی، ان کو غصہ آئے گا اور وہ ہر چیز کو چکناچور کرکے دھر دیں گے، اپنی ان تمام گلی سڑی چیزوں کو پرزہ پرزہ، ریزہ ریزہ کر دیں گے — لوگوں کی یہ برداشت ضرور ختم ہوگی، یقیناً ختم ہوگی...''

شراب خانے پہنچنا ہم دونوں کو نصیب نہ ہوا — ہماری مڈبھیڑ درباری ملاحوں کے ایک جتھے سے ہوئی جو ایک قحبہ خانے کا محاصرہ کئے ہوئے تھے — الانوزوف مل کے مزدور اس قحبہ خانے کا بچاؤ کر رہے تھے — روبسوف نے اپنی عینک اتاری اور بڑے مزے میں کہا

"یہاں ہر چھٹی کے دن جھگڑا ہوتا ہے!" بھیڑ کرنے والوں میں اسے اپنے کئی دوست نظر آئے اور وہ اپنے ساتھیوں کا دل بڑھانے والے نعرے لگاتا ہوا جنگ میں شریک ہو گیا: "ہاں، مقابلہ کئے جاؤ بیٹو! پیس دو ان مینڈکوں کو! کھینچ نکالو ان پدیوں کا اخ! اخ!"

اس نے جوش دیکھ کر حیرت ہوتی تھی — یہ معمولی انسان کس خوبی سے ملاحوں کے درمیان بڑھتا ہوا اپنے لئے راستہ نکالتا جا رہا تھا — مگر وہ رہا محفوظ تو دشمن کے دھکوں سے گرتا — مجمع بڑے جوش اور بڑی دلچسپی سے لڑ رہا تھا جیسے کسی سے غصہ یا بغض نکالنا نہ ہو بلکہ صرف لطف لینے کے لئے لڑ رہا ہو۔ [illegible] ہو گئی تھی اور وہ تنگی دو سمت تلاش کر رہی تھی! ملاحوں کے ایک لٹنے اندھیرے مجمع نے میں مزدوروں کو یہاں تک دھکیلا کہ چوتھی سیڑھی تک چھوٹے سے دولہ، خوشی کی چیخیں بلند ہوئیں:

"لینا اس گنجے سپاہی کو!"

مزدوروں میں سے دو ملاح کی جیب پر بڑھے لئے اور ایک جوشیلا راگ شروع کیا:

ہم چور نہیں، ڈاکو
بھی نہیں، رہزن بھی نہیں —
ہم ہیں جہاز پر کام کرنے والے مچھیرے —
ہاں ہاں ہم مچھیرے ہیں!

پولیس کی سیٹی سنائی دی — اندھیرے میں وردیوں کے بٹن کے بٹن چمکنے لگے — پیروں کی جیب کے نیچے سے کیچڑ کی چھپ چھپ سنائی دینے لگی — مجمع سے گیت لہراتا رہا:

ہم ڈالیں جال، نکالیں جال،
ہم سوکھے ساحل پر پھیلائیں جال،

موٹے سوداگروں کے تہہ خانوں میں اپنے جال بچھائے ہیں...

"بس بس! مرتے کو نہ مارو!"
"دادا، وہ دیکھو!"

آخر کار میں اور روبتسوف اور ہمارے چھ دوست دشمن ملا کر تھانے کی طرف کھینچے جانے لگے — خزاں کی رات کی نئی نویلی خاموشی میں گیت ہم کو دور تک سنائی دیا:

تو ہم نے چالیس مچھلیاں پکڑ لیں،
تو ہم نے بھر لئے اپنے جال

روبتسوف نے خون تھوک کر اور اپنی زخمی ناک جھٹک کر بڑی متانت سے کہا "یہ ولگا کے سب کے لوگ — کتنے اچھے لوگ ہیں!" پھر میرے کان میں دھیرے سے بولا "تم نکل بھاگو — اس گڑبڑ میں ذرا موقع دیکھتے رہو اور کھسک جاؤ — آخر تم کو حوالات جاکے کیا لینا ہے؟"

پہلو میں ایک تنگ سی گلی پڑی، میں جھٹ سے اس میں غوطہ مار گیا — ایک لمحے سے ملاح نے بھی میری ہی طرح کیا — پھر ہم لوگ ایک دیوار کودے اور پھر دوسری — اور یہ میری اور میرے محبوب دوست نکیفا روبتسوف کی آخری ملاقات تھی!

میری زندگی میں دن بدن خلا بڑھتا جا رہا تھا — طالب علموں کا ہنگامہ شروع ہو گیا تھا لیکن نہ وہ ہنگامہ میری سمجھ میں آتا تھا نہ اس کے اسباب اور اس کے مقاصد سمجھ میں آتے تھے — مجھے وہ بانکے طالب علم شور مچاتے نظر آتے تھے لیکن اس کے پیچھے جو بنیادی جدوجہد تھی وہ نہیں دکھائی دیتی تھی اور میں یہ سوچتا تھا کہ یونیورسٹی میں پڑھنے کی خاطر انسان ہر طرح کی اذیت بھی برداشت کر سکتا تھا — اگر مجھ سے کوئی کہتا کہ "تم یونیورسٹی میں رہو

مگر اس کے عوض میں مجھ کو نکولائیفسکی چوک میں کھڑا کر کے کوڑے مارے جائیں گے،، —— تو غالباً میں راضی ہو جاتا۔

سیمیونوف کی بیکری میں جب آیا تو مجھے پتہ چلا کہ وہاں کے نانبائی، [illegible] اور مستری سب یونیورسٹی جا کر طالب علموں کو پیٹنے کا پلان بنا رہے ہیں۔

''ہم لوگ [illegible] تولنے کے باٹ سے حملہ کریں گے،، وہ لوگ ہنس ہنس کر غصے میں کہہ رہے تھے۔

میں نے ان لوگوں سے بحث کرنی چاہی۔ لیکن یکایک یہ محسوس کر کے ششدر رہ گیا کہ میرا بھی ان طالب علموں کی طرف داری میں کچھ کہنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اور جب میں وہاں سے چلا تو کھویا کھویا رہتا تھا۔ دل میں ایک ایسا دکھ سا تھا جو بے انتہا تھا اور جس کو ناپا نہیں جا سکتا تھا۔ رات گئے تک میں کابان کے کنارے بیٹھا اس کے سیاہ پانی میں کنکر پھینکتا رہا اور وہی ایک خیال تین الفاظ کے روپ میں باربار میرے ذہن میں چکر کاٹتا تھا:

''میں کیا کروں؟،،

اس خلا کو کسی طرح بھرنے کے لئے میں نے وائلن سیکھنا شروع کر دیا۔ رات کے وقت میں دوکان میں مشق کیا کرتا تھا جس سے دربان اور چوہوں کو بہت پریشانی ہوتی تھی! مجھے موسیقی سے عشق تھا اور اس نئی دلچسپی اور شوق کے بہاؤ میں بہہ گیا۔ لیکن ایک رات میں سبق سیکھتے سیکھتے ایک منٹ کو باہر گیا تو میرے ماسٹر نے جو تھیٹر آرکسٹرا میں وائلن بجاتا تھا روپئے کی دراز کھول لی جسے میں تالا لگانا بھول گیا تھا۔ اب جو میں واپس آتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ جلدی جلدی اپنی جیبوں میں روپئے بھر رہا ہے۔ جب اس نے مجھے دروازے پر کھڑا دیکھا تو اپنا بیوقوف شیو کیا ہوا چہرہ میری طرف بڑھایا جیسے تھپڑ مارنے کو کہہ رہا ہو اور آہستگی سے بولا:

''لو —— مارو!،،

اس کے بے رنگ ہونٹ ذرا سے ہلے ہوئے، بڑی بڑی آنکھوں سے غیرمعمولی طور پر آنسو کے بڑے بڑے قطرے ٹپک رہے تھے — بے اختیار میرا دل چاہا کہ اسے ماروں! لیکن اپنے آپ کو اس سے باز رکھنے کے لئے میں زمین پر [illegible] اور دونوں مٹھیوں کو [illegible] اسے حکم دیا کہ روپیہ دراز میں واپس رکھ دو — اس نے [illegible] اور جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا، پھر رک گیا اور وہی مکار احمقانہ اور خوفزدہ آواز میں بولا:

''مجھے دس روبل دے دو!''

میں نے اسے دس روبل دے دئے لیکن وقت [illegible] —

دسمبر میں میں نے فیصلہ کیا کہ خودکشی کر لوں — بعد میں میں نے اسی واقعے کو اپنی ایک کہانی ''مزدور کی زندگی کا ایک حادثہ'' میں لکھا — اس کہانی کا پس منظر میری اپنی خودکشی ہے لیکن میں اس کہانی میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں کیونکہ وہ ناگوار اور اوپری دکھاوا ہے اور باطنی سچائی سے خالی — ویسے میرا خیال ہے کہ باطنی سچائی کا یہ فقدان ہی اس کہانی کی خوبی ہے — اس میں واقعات صاف صاف بیان کئے گئے ہیں لیکن ان کی تفسیر میری کی ہوئی نہیں معلوم ہوتی اور پوری کہانی کا مجھ سے کوئی واسطہ نظر نہیں آتا — ادبی حیثیت سے قطع نظر اس کہانی میں، کم از کم میرے لئے، کوئی شے ایسی ضرور ہے جو گوارا ہے — جو اپنے نفس پر فتح کو ظاہر کرتی ہے —

میں نے بازار سے ایک سیکنڈ ہینڈ طمنچہ خریدا جس میں چار گولیاں بھریں — میں نے ایک گولی اپنے سینے میں مار لی — کوشش تو میں نے یہ کی تھی کہ وہ دل میں لگے لیکن وہ صرف پھیپھڑے کو چھید کر رہ گئی — اور ایک ماہ بعد میں اپنے کو بہت ہی احمق سمجھتا ہوا اور بے حد شرمندہ بیکری میں کام پر واپس آ گیا —

مجھے یہ کرتے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ ایک شام مارچ کے آخر میں بیکری سے لوٹتے ہوئے میں نے دیکھا کہ دوکان کے پیچھے والے کمرے کی کھڑکی پر خوخول بیٹھے ہیں — وہ ایک موٹا سا سگریٹ پی رہے تھے اور کسی فکر میں کھوئے، چاروں طرف منڈلاتے ہوئے دھوئیں کو گھورے جا رہے تھے — سلام دعا کئے بغیر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے اور پوچھا:

”تمہارے پاس کچھ خالی وقت ہے۔“

”بیس منٹ —“

”بیٹھ جاؤ، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے —“

ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی وہ موٹے کپڑے کا کوٹ پہنے ہوئے تھے جس کے سب بٹن بند تھے۔ سنہری داڑھی چوڑے سینے پر پھیلی ہوئی تھی اور چھوٹے ترشے ہوئے بال برش کی طرح ان کی ضدی پیشانی پر کھڑے تھے۔ پاؤں میں بھاری دیہاتی جوتے تھے جن سے تارکول کی تیز بو آ رہی تھی —

”تو اب بات یہ ہے“ انہوں نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا ”کیوں چاہتے ہو تم میرے یہاں رہنے کے لئے؟ میں کراسنوویدووا گاؤں میں رہتا ہوں جو والگا کے کنارے اتار کی طرف تقریباً تیس میل دور ہے — وہاں میری ایک دوکان ہے، تم دوکان میں میری مدد کرنا۔ اس میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لگے گا — میرے پاس ایک اچھی لائبریری ہے — تمہیں پڑھنے لکھنے میں بھی مدد دے سکتا ہوں — راضی ہو؟“

”ہاں —“

”تو کرباتوف کے گھاٹ پر جمعہ کی صبح کو چھ بجے پہنچ جانا اور کراسنوویدووا کی کشتی دریافت کر لینا — مالک کا نام واسیلی پانکوف ہے — ویسے دراصل تمہیں پوچھنے پاچھنے کی بھی ضرورت

[illegible] کی کولخوز میں خود وہاں جا کے تمہیں [illegible] جاؤں گا۔ خدا حافظ —"

جاتے سوچتے ہوئے انھوں نے اسے ایک [illegible] کے لئے [illegible] اور دوسرے [illegible] سے اندر کی جیب سے ایک [illegible] [illegible] کی نوٹوں کی گڈی نکالی اور بولے:

"[illegible] دونوں کی بات چیت میں چھپا مت رکھے اور [illegible] — میرا [illegible] [illegible] میں تھے، [illegible] سمجھنے —"

وہ روانہ ہو گئے اور پیچھے مڑ کر دیکھا تک نہیں — [illegible] جیسے [illegible] لمبے تڑنگے جیسے [illegible] — بھاری جسم بڑے مزے میں ادھر ادھر جھومتا جھامتا!

دو دن بعد میں کراسنووودسک کو روانہ ہو گیا —

والگا نے حال ہی میں اپنی زنجیریں توڑی تھیں — جمی ہوئی [illegible] برف کے بڑے بڑے ٹکڑے ندی کے بہاؤ کے ساتھ نیچے کی طرف بہہ رہے تھے اور گدلے بھنوروں میں ڈوبے جا رہے تھے — ہماری کشتی بار بار ان کو [illegible] اور وہ کشتی کے پہلوؤں اور تختوں سے ٹکرا ٹکرا کر چھپتے جا رہے تھے۔ بعض کشتی سے ٹکرا کے [illegible] ہو جاتے تھے اور شیشے کی نوکدار [illegible] کرچیں سی اڑنے لگتی تھیں۔ ہوا خوب تیز چل رہی ہے اور [illegible] کو دھکیل دھکیل کر ساحل کی طرف لے جا رہی ہے — سورج کی چکا چوند کرنے والی کرنوں کا عکس [illegible] کے [illegible] پہلوؤں سے پھوٹتی ہوئی [illegible] روشنی میں نظر آ رہا ہے — کشتی میں خوب بوجھ بھرا ہوا ہے — پیٹیاں، ٹنکیاں، بوریاں — اور کشتی بادبان تان کے چل رہی ہے — [illegible] کے ہاتھ میں [illegible] ہے — وہ نوجوان کسان ہے — ذرا بانکے اور رنگیلے انداز سے کپڑے پہنے ہوئے ہے — بھیڑ کے رنگے ہوئے چمڑے کی جیکٹ پہنے، سر پر [illegible]، رنگ برنگ دھاگوں سے کڑھی ہوئی ہے — اس کا چہرہ مسکون

ہے، آنکھیں سرد ہیں اور وہ نہایت باوقار اور پتے تولنے والے لگتے ہیں — کسان بالکل نہیں معلوم ہوتے — کشتی کے اگلے حصے پر ہاتھ میں انکسی لئے کوکوشکن ہے جسے پانکوف نے مزدوری پر رکھ چھوڑا ہے — ملاح، چھوٹا سا آدمی، بہت ہوا لوٹ، کمر میں رسی کی بنی بندھی ہوئی اور بڑی بڑی ہیٹ جو کبھی کسی پادری کی رہی ہوگی۔ اس کے چہرے پر چوٹ کے نشان ہیں — وہ پل کے کھودوں پر باربار اپنی انکسی پھینکتا ہے اور صاحب سے کہتا ہے:

''دور ہو... کیا سمجھے ہو اپنے آپ کو، یہ چلے کدھر،،

بادبان کے نیچے جو رسوں کا ڈھیر ہے اس پر میں اور رومس بیٹھے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ کہتے ہیں:

''کسان لوگ مجھے پسند نہیں کرتے، حتیٰ کہ خوشحال کسان! اور تمہیں بھی اس سلسلے میں اپنے حصے کی تلخی چکھنی پڑے گی —،،

کوکوشکن اپنی انکسی کشتی پر آڑا رکھ دیتا ہے اور اپنا تمتمایا چہرہ ہماری طرف موڑ کر بڑے مزے میں کہتا ہے:

''سچ کہئے، دراصل پادری صاحب آپ سے سب سے زیادہ نفرت کرتے ہیں......

''وہ تو ہے ہی،، پانکوف اتفاق کرتا ہے —

''آپ تو اس کے حلق کی ہڈی ہیں — کتے کی دم''،،

''لیکن میرے دوست بھی ہیں اور وہ تمہارے بھی دوست ہوں گے،، خوخول بات جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں —

ہوا میں خوب ٹھنڈک ہے — مارچ کا چمکتا ہوا سورج ابھی زیادہ گرمی نہیں پہنچا رہا ہے — دریا کے ساحل پر سیاہ ننگی ننگی شاخوں والے درخت جھوم جھوم کر جھکورے لے رہے ہیں — یہاں وہاں ساحل کی سایہ دار درازوں میں یا کگارے کے قریب پھیلی ہوئی جھاڑیوں کی چھتریوں میں مخملی برف کے ٹکڑے ابھی تک جمے

ہوئے ہیں — بھٹکتے ہوئے برف کے ٹکڑوں سے ڈوبتے سورج کی دھار ہو رہا ہے جیسے خزانے میں جڑے ہوئے ہیروں کا بکھرا ہوا گنبد — مجھے ... محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں —

کوکوشکن اپنی نشست میں ہلتا ہو پھیرتے ہوئے قدسہ کھنکارے سکتا ہے:

''یہ سوچ رہے کہ آپ پادری صاحب کی کوئی سوئی ہو ہیں نہیں مگر یہ تو ان کا فرض منصبی ہے — ہے نا، کہ ہمیشہ مخلوق سے محبت کریں جیسا کہ کتابوں میں لکھا ہے —''

رومانس انہیں سے ہنس پڑی تھیں اور کہتی تھیں ''مگر یہ تم کس سے جلے بھنے بیٹھے ہو؟''

''کسی سے خاص تو نہیں — وہ کچھ بے ہودہ قسم کے لوگ تھے سمجھ ہی میں نہیں آئے — اور کبھی یہ سنا ہے کہ چوری کرتے ہیں تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوتا۔'' کوکوشکن جواب دیتا ہے — پھر بڑے فخر سے کہتا ہے ''ایک مرتبہ کچھ فوجیوں نے مجھے پیٹا! توپ خانے کے لوگ تھے —— وہ کیسا زوردار معاملہ — معلوم نہیں میں زندہ کیسے بچ گیا —''

''لیکن انہوں نے ایسا کیوں کیا؟''

''کب؟ کل؟ یا ان فوجیوں نے؟''

''ہوں —— کل —''

''کون انسان کبھی یہ بتا بھی سکتا ہے کہ یہ لوگ کیوں کسی پر ٹوٹ پڑتے ہیں — یہ ہمارے عوام ہیں کہ ڈھیر ہیں، کرتے ہیں کرتے! ذرا سی بات ہوئی اور سڑکوں پر امڈ آئے — کوئی ان کا دین و منصب ہی نہیں ہے —— جسے استعمال کرتا''

رومانس کہتی ہیں ''میرا تو خیال ہے کہ وہ لوگ تمہاری زبان کی وجہ سے تمہاری دھنائی کرتے ہیں — تمہیں کچھ ہوش بھی رہتا ہے کہ کیا کہتے ہو، بس بے حد بے پروائی سے زبان چلتی رہتی ہے تمہاری!''

''ہاں ہو سکتا ہے! مجھے ویسے ذرا دیر ہو چکی رہی ہے، عادت ہی ایسی پڑی ہو گئی ہے کہ لوگوں سے سوالات کئے جاتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ کوئی نئی بات سن کر مجھے خوشی بہت ہوتی ہے۔''

کشتی کی ٹکر زور سے برف کے ایک تودے سے ہوتے ہوتے بچ گئی ہے۔ دوسرا تودہ کشتی کے پہلو میں ہی چل رہا ہے جیسے کوئی کشتی میں پیچھا کر رہا ہو۔ کوکوشکن ذرا سا گھبرایا ہے، پھر بھی کھسیانا سا ہے۔ مانکوف اس کو ملامت کرتا ہے ''انسان، اسے کام کا دھیان رکھنا تھا''

''پھر مجھے دل میں نہ لاؤ''، کوکوشکن برف کو دیکھتے اور ہنستے ہوئے کہتا ہے ''میں تو سے ٹماسک کروں گا تو ایسا کام کیسے کروں گا۔''

پھر دونوں بڑے مزے میں ایک دوسرے سے الجھنے لگے ہیں اور روماس مجھ سے مخاطب ہوئے ہیں:

''یہاں کی زمین ہماری طرف کی زمین سے خراب ہے — میرا مطلب ہے سولرین کے طرف کی — لیکن لوگ یہاں کے بہت خوب ہیں — بڑے محنتی اور جوہر والے۔''

میں بڑے اعتماد سے روماس کی بات کی تائید کرتا ہوں۔ مجھے ان کے طور طریقوں کا پرسکون پھیلاؤ، بات کرنے کا ٹھہرا ہوا انداز اچھا لگتا ہے — سیدھا سادہ مگر زوردار اور پراثر! مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ آدمی ہے کہ جو واقعی وسیع معلومات رکھتا ہے اور پھر ایسا آدمی جس نے اپنے ہم جنس انسانوں کے متعلق اپنا ایک خاص نظریہ اور معیار قائم کر لیا ہے — یہ بھی ایک بڑی خوش گوار بات ہے کہ وہ مجھ سے یہ پوچھتے تک نہیں کہ میں نے خودکشی کی کوشش کیوں کی تھی — اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ نہ جانے کب کا یہ سوال پوچھ چکا ہوتا۔ اور میں

اس سوال سے اس قدر عاجز آ گیا ہوں کہ کیا کہوں — اس کا جواب دینا بھی آسان بات نہیں — شیطان ہی جانے کہ میں نے کیوں اپنی جان دینے کی کوشش کی تھی — اگر خود مجھ سے پوچھیں تو میں انہیں غالباً ایک طویل اور احمقانہ جواب دوں گا — اور بہر حال اب تو میں اس بات کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتا — دنیا کس قدر حسین ہے، کس قدر روشن، کس قدر وسیع!

ہم اپنی کشتی کو اونچے ساحل کے سائے سائے لے جا رہے ہیں — ہمارے بائیں کو دریا کا وسیع پھیلاؤ ہے جو اس طرف کے نچلے ساحل پر حملہ آور ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے — دریا رہ رہ کے بھی آگے بڑھ کر جھاڑیوں کو بھگونے اور اچھالنے کے لئے اوپر کی طرف اٹھتا ہوا نظر آ سکتا ہے اور موسم بہار کے اچھلتے کودتے چشمے زمین کے ہر کنارے، ہر دراڑ کو بھرتے ہوئے، دریا کے پانی سے ملنے کے لئے بے قراری سے دوڑتے ہیں — سورج نیچے جھک جھک کر مسکرا رہا ہے اور اس کی کرنوں کے نور میں زرد چونچوں والی مستانی شور مچاتی، ایک دوسرے سے لڑتی بھڑتی، اپنے گھونسلے بنانے میں مصروف ہیں — ان کے سرمئی جسم سورج کی شعاعوں میں صیقل کئے ہوئے فولاد کی طرح دمک رہے ہیں — لہلہاتے ہوئے میدانوں میں ننھی ننھی چمکیلی سبز گھاس بے باکی سے سر اٹھا کر آفتاب سے نظریں ملا رہی ہے — جسم کو ٹھنڈک لگ رہی ہے اور دل میں ایک پرسکون مسرت ہے، ساتھ ہی دل میں روشن امیدوں کی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں — آہ! موسم بہار میں دنیا کس قدر پر لطف جگہ ہوتی ہے!

ہم لوگ دوپہر کو 'کراسنوویدوو' پہنچ گئے — اونچے ٹیلے پر ایک گرجا بنا ہوا تھا جس کے مینارے نیلے تھے — گرجا سے لگ کر ٹیلے کے کنارے کنارے کسانوں کے مضبوط اور اچھے گھروں کی قطار تھی — سورج کی روشنی پڑنے سے پھوس کی زردی دمک کر ریشم کی طرح جھلملاتی تھی اور سادی ہوتے ہوئے بھی آنکھوں کو بھلی لگتی تھی

والگا پر اسٹیمروں میں گذرتے ہوئے، میں نے اکثر اس گاؤں کو دیکھا تھا اور دل میں اس کی تعریف کی تھی!

تولوبسکن نے اور میں نے مل کر کشتی سے سامان اتارنا شروع کیا۔ وہ ہر کشتی کے کنارے سے مجھے بورے تھماتے جاتے اور کہتے جاتے:

"تم یقیناً بہت مضبوط ہو، بہت طاقتور ہو!"

پھر انہوں نے گودام میں لکڑی کی اونچی سیڑھی پر چڑھتے چڑھتے کہا:

"تمہارے سینے میں درد تو نہیں ہوتا؟"

"نہیں، بالکل نہیں —"

جس ہوشیاری سے انہوں نے یہ سوال مجھ سے پوچھا اس سے میں بے حد متاثر ہوا۔ پھر ان لفظوں کو یہ سمجھ کر کہ میں نے خود کسی کی کوشش کی بھی تو یقیناً مجھے ان سے بہت جھینپ اور ہچکچاہٹ محسوس ہوئی۔

تولوبسکن نے ناصحانہ انداز سے کہا "ہاں ہاں — ہو تو بہت مضبوط — دم سے بھی زیادہ مضبوط جس کو کھینچ کھینچ کے کس علاقے سے آئے ہو میاں لڑکے؟ نزنی نووگورود سے؟ تو پانی کی مجبوریاں ہو کرتا ہے؟ تم لوگوں کے متعلق عام خیال تو یہی ہے لوگ بھی کہتے ہیں! اور یہ بھی تو کہا جاتا ہے "لمبو، لمبو، سارس کدھر کو اڑے گا؟ ہے نا؟"

ڈھلوان پر سے ایک لمبا دبلا پتلا کسان جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا آیا — سوتی قمیص اور پتلون، گھنگھریالی داڑھی، سر پر سرخ لمبے بال — اس کے ننگے پاؤں چکنی مٹی پر پھسلتے ہوئے رستے میں پڑے والے چھوٹے چھوٹے چمچماتے جسموں کو منتشر کر رہے تھے —

کنارے پر آ کر وہ صاف آواز میں بڑی محبت سے بولا:

"خوش آمدید!"

پھر ایک نظر ہمارے دم پر ڈالی، جھک کر دو موٹے موٹے ڈنڈے اٹھائے اور انہیں ساحل سے لگا کر کشتی کے کناروں پر ٹکا دیا — پھر وہ آسانی سے پھلانگ کر کشتی میں آ گیا اور حکم دیا:

''چپو، سکندر، زینے کی سیڑھی کرو — اے میاں لڑکے، تم ادھر ذرا ہاتھ لگاؤ —''

وہ ایک خاص طرح سے خوبصورت تھا اور صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بہت مضبوط ہے، ہلکی نیلی آنکھیں شدت سے چمک رہی تھیں، سرخ گال تھے، سیدھی ستواں بڑی سی ناک تھی —

''ایزوت، تمہیں سردی لگ جائے گی،'' روماس نے کہا —

''کس کو؟ مجھے؟ کبھی ہرگز بھی نہیں —''

ہم لوگوں نے مٹی کے تیل کا ایک ڈرم لڑھکا کر کنارے پر پہنچایا — ایزوت نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پوچھا:

''کیا دوکان میں مدد دینے آئے ہو؟''

کوکوشکن نے کہا ''ذرا اس سے کشتی لڑنے کی کوشش کر دیکھنا —''

''معلوم ہوتا ہے تمہاری ہنڈیا پھر کسی نے سلگا دی —''

''ارے تو پھر ایسوں کا علاج ہی کیا ہے؟''

''کیسوں کا؟''

''ایسوں کا ہی جو خواہ مخواہ لوگوں کی ہڈیاں چٹخاتے ہیں....''

''ہوں،'' ایزوت نے چڑ کر جواب دیا۔ پھر روماس سے مخاطب ہو کر بولا ''گاڑیاں بس ابھی یہاں پہنچتی ہیں — میں نے آپ کو بڑی دور سے دریا پر کشتی میں دیکھ لیا تھا۔ بڑی جلدی پہنچ گئے آپ — اب آپ گھر جائیے میخائل، سامان کی ذمہ داری میری!''

روماس کی طرف اس کا دوستانہ اور محبت کا رویہ صاف ظاہر ہو رہا تھا بلکہ یہ رویہ محافظ کا بھی تھا حالانکہ روماس اس سے عمر میں تقریباً دس سال بڑے تھے۔

آدھہ گھنٹے بعد میں گاؤں کے ایک مکان میں داخل ہوا جو نیا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا کیونکہ دیواروں سے ابھی تک نئے مسالے کی خوشبو آ رہی تھی۔ رہنے کا کمرہ صاف اور آراستہ تھا۔ سر نقطوں والی ایک عورت تیوری سے کھانے کی میز لگاتی ہوئی ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ خوخول ایک کھلے ہوئے سوٹ کیس میں سے کتابیں نکال کر ان کو تندور کے پاس والی الماری میں جما رہے تھے۔ مجھ سے بولے:

"تمہارا کمرہ اوپر دوچھتی میں ہے۔"

میں نے کمرے کی کھڑکی میں سے گاؤں کا ایک حصہ دیکھ سکتا تھا۔ ہمارے مکان کے سامنے ایک نالہ تھا جس پر تمام جھونپڑیاں اتری ہوئی تھیں۔ یہاں وہاں حماموں کی چھتیں نکلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ نالے سے پرے باغ اور میدان تھے جو سیاہ سیاہ لگتے تھے اور جیسے ان کی سمت ڈھلتی ہوئی جا کر اس کے پاس جنگلوں کی نیلی لکیروں سے مل گئی تھیں۔ ایک حمام کی چھت کے کنارے پر ایک کسان نیلے کپڑے پہنے کلہاڑی لئے گھوڑے کی طرح سوار تھا۔ آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنائے وہ والگا کی طرف تکے جا رہا تھا۔ گاڑیوں کے پہیوں کی چوں چرں سنائی دے رہی تھی۔ ایک گائے زور سے ڈکرا رہی تھی۔ سر سے پاؤں تک کالے کپڑے پہنے ایک بڑھیا ایک پھاٹک سے نکلی اور زور سے چلائی:

"پھٹکار ہو تم پر!"

اس کی آواز سن کر دو چھوٹے چھوٹے لڑکے جو بڑے جوش اور محنت سے ایک چھوٹی سی جوئبار پر مٹی اور پتھروں سے پل بنا رہے تھے، اچھل پڑے اور جتنی تیزی سے بھاگ سکتے تھے بھاگ نکلے۔ عورت نے لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھایا، اس پر تھوکا اور اسے جوئبار میں ڈال دیا۔ پھر اس نے اپنا پاؤں اٹھایا جس میں مردانہ جوتا چڑھا ہوا تھا اور زور سے بچوں کے بنائے ہوئے پل کو کچل دیا اور ڈھلان سے اترتی ہوئی والگا کی طرف چلی گئی۔

یہاں میری زندگی کیسی گذرے گی:

مجھے کھانا کھانے کے لئے بلایا گیا۔ میں اندر آیا تو ایزوت میز کے پاس اپنی لمبی ٹانگیں آگے کو پھیلائے بیٹھا تھا — اس کے ننگے پاؤں تانبے مانند سرخ تھے۔ وہ روماس سے باتیں کر رہا تھا لیکن مجھے دیکھ کر چپ ہو گیا۔

روماس نے مجھے شوخ انداز میں کہا "[illegible]، تو پھر کیا ہوا؟ کہیں جاؤ —"

"بس اتنی سی بات ہے — تو فیصلہ یہ ہوا ہے کہ اب ہم لوگ خود ہی بندوبست کریں گے — آپ اپنے ساتھ یا تو طمنچہ رکھیں یا موٹی لکڑی وکڑی لے کر باہر نکلا کریں — اور ہر شخص کی موجودگی میں زیادہ بات نہ کیجئے — کوکوشکن کی اور اس کی دونوں کی زندگی بالکل قابو سے باہر ہیں —— عورتوں کی طرح — اور یہ میاں لڑکے؟ مچھلی پکڑنے سے دلچسپی ہے؟"

"نہیں —"

روماس نے باتیں کرنی شروع کیں کہ معمولی اور غریب باغبانوں اور پھل پیدا کرنے والوں کو منظم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کو امیر کسانوں کے پنجے سے چھڑایا جا سکے — ایزوت غور سے سنتا رہا، آخرکار بولا:

"اس طرح تو یہ بڑے بڑے توند والے آپ کو مطلق چین نہیں لینے دیں گے —"

"دیکھا جائے گا —"

"آپ میری بات یاد رکھئے گا"

ایزوت کو دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کارونن اور زلاتووراسکی نے اپنی کہانیوں میں ایسے ہی کسانوں کی عکاسی کی ہے — کیا یہ ممکن ہے کہ یہاں میرا تعلق واقعی کسی ایسی چیز سے ہو جائے جس میں سچ مچ سنجیدگی اور خلوص ہے، کہ

اب مجھے ایسے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے جو سچ مچ کچھ کر رہے تھے۔

کھانا ختم کرکے ایزوت نے کہا:

"دیکھئے مختار، جلدی نہ کیجئے گا۔ کوئی اچھا اور صحیح کام جلدی میں نہیں ہوتا۔ ذرا آہستہ چلئے گا۔"

جب وہ چلا گیا تو روماس سوچتے ہوئے بولے:

"یہ آدمی ذہین اور ایماندار ہے، بدقسمتی سے جاہل ہے۔ مشکل پڑھ سکتا ہے لیکن پڑھنے کی کوشش بہت کر رہا ہے۔ تم اس میں اس کی مدد کر سکتے ہو!"

شام تک روماس مجھے دوکان کی چیزوں کی قیمتیں وغیرہ بتاتے رہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا:

"یہاں جو دو اور دوکانیں ہیں ان سے میں سستا بیچتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے اور ہر ممکن چال مجھ سے چلتے ہیں۔ اب وہ لوگ مجھ کو پیٹنے کی سوچ رہے ہیں۔ میں کوئی سوداگری کے شوق میں یا پیسہ کمانے کے لئے یہاں نہیں رہتا ہوں۔ یہاں رہنے کی اور وجہیں ہیں۔ یہ دوکان بھی تمہاری اس بیکری کی ہی قسم کی چیز ہے...."

میں نے ان سے کہا کہ اسے تو میں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔

"ہاں اور کچھ اور لوگوں کو کسی نہ کسی طرح تو سمجھانا ہی ہوتا ہے نا؟"

دوکان کی کھڑکیاں چڑھا دی گئیں، تالا ڈال دیا گیا۔ ہم لوگ چائے لئے دوکان کے چکر لگا رہے تھے اور بالکل ہمارے ساتھ ہی ساتھ باہر سے کوئی چلتا جاتا۔ کبھی ایسا سنائی دیتا کہ کوئی بڑی احتیاط سے قدم اٹھا رہا ہے، کبھی کیچڑ سے پچ پچ کی آواز آتی ہے اور کبھی بھاری بھاری قدم برامدے تک آ جاتے۔

''دیکھا؟ سنی اس کی آہٹ؟ یہ سیکون ہے، [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ٹوپی میں — بڑا [illegible] آدمی تھے اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تھے جیسے ٹوپی [illegible] جیسی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] — [illegible] [illegible] سے جو بات [illegible] [illegible] اس میں [illegible] [illegible] [illegible] — [illegible] سی [illegible] [illegible] موجود ہے — سب سے [illegible] [illegible] وقت [illegible] [illegible]......

اس کے بعد وہ [illegible] والے کمرے میں [illegible] [illegible] [illegible] سے [illegible] چوڑی [illegible] لگے [illegible] تھے — [illegible] جاتی اور داڑھی میں دھونس کی چھوٹی چھوٹی [illegible] بھرے ہوئے [illegible] [illegible] سے [illegible] [illegible] [illegible] اور [illegible] [illegible] کے [illegible] میں [illegible] لگے — انہوں نے کہا کہ وہ بہت دنوں سے [illegible] رہے ہیں کہ میں اپنی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] میں بڑی صلاحیتیں ہیں — [illegible] مزاج ہو [illegible] ہے کہ تمہارے [illegible] [illegible] [illegible] ہیں — تمہیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ [illegible] ہے، لیکن صرف اس طرح کی تعلیم نہیں جس میں [illegible] تمہارے اور تمہارے ماحول کے عوام اور کسانوں کے درمیان دیوار کی [illegible] — ایک [illegible] آدمی تھا، نہایت متعصب، لیکن اس نے ایک بڑے کام کی بات کہی تھی ''جو چیز بھی پڑھی یا پڑھائی جاتی ہے وہ سب انسان ہی سے حاصل ہوتی ہے'' — یہ سچ ہے کہ عوام جو کچھ سکھاتے ہیں وہ کتابوں سے زیادہ [illegible] ہوتا ہے — ان کی تعلیم میں [illegible] سختی ہوتی ہے لیکن انسان اس طرح سے جو کچھ سیکھتا ہے اس کی جڑیں بہت زیادہ مضبوط ہوتی ہیں —''

پھر انہوں نے اس عام خیال کا اظہار کیا کہ سب سے پہلا اور سب سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ کسانوں کے دماغوں کو بیدار کیا جائے — اگرچہ اس خیال کا اظہار میں اور لوگوں سے پہلے بھی سن چکا تھا لیکن اس وقت رومس کی زبان سے ان الفاظ میں ایک گہری اہمیت پیدا ہو گئی تھی —

''یہ جو تمہارے صاحب علم ہیں نا یہ عورتوں سے محبت کی بات تو بہت کرتے ہیں — لیکن میں ان سے کہتا ہوں کہ یہ ہو نہیں سکتا۔ عورت سے محبت کر ہی نہیں سکتے۔ اس طرح کی محبت بس بات ہی بات ہے اور کچھ نہیں —''

میری سرخ مجسس نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ داڑھی ہی داڑھی میں ہنس دیتے۔ اس کے بعد اچھا تو کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے اور جوش و خروش سے اپنی بات جاری رکھی:

''محبت جس کے معنی ہوں مہربانی، درگزر، معافی، سمجھ بوجھ — ایسی محبت اگر عورتوں سے کی جائے تو ٹھیک بھی ہے — جاہل عورتوں کی، ان کی حماقت سے چشم پوشی اور ان کے بھٹکنے سے درگزر کر سکتے ہیں۔ ان کے گناہوں کو ان کی کمزوری کی وجہ سے قبول کر سکتے ہیں۔ ان کے مظالم اور توہین کو معاف کر سکتے ہیں؟ ایسا کرنا چاہئے ہمیں؟''

''نہیں —''

''یہ بات ہے — شہر میں جو تمہارے دوست ہیں وہ سب کے سب نیکراسوف کو رٹتے ہیں، اسی کی نظمیں گاتے ہیں — اچھا تو میں کہتا ہوں کہ نیکراسوف کے سہارے آپ زیادہ آگے نہیں جا سکتے — کسان سے یہ کہنا ہی ہوگا کہ ''دیکھو بھائی، جہاں تک اچھائی کا سوال ہے تو برا آدمی نہیں ہے لیکن جو زندگی بسر کر رہا ہے وہ نہایت بری ہے — اور تو کچھ بھی نہیں جانتا کہ اپنی زندگی کو بہتر اور آسان بنانے کے لئے کیا کرے بلکہ ایک جنگلی جانور بھی تجھ سے زیادہ سمجھداری سے اپنی زندگی کی ضروریات کا خیال کرتا ہے اور اپنا بچاؤ تجھ سے بہتر طریقے پر کرتا ہے — اور یہ کسان لوگ ہی دنیا کی ہر چیز کی جڑ بنیاد ہیں — شرفا، پادری لوگ، عالم لوگ، زار — یہ سب ماضی میں کسان ہی تو تھے — سمجھے؟ صاف ہوا معاملہ تمہارے دماغ میں؟ ابھی بات

ہے۔ تو پھر اس طرح زندگی بسر کرنا سیکھو کہ پاؤں تلے روندے نہ جاؤ۔۔۔''

وہ اٹھ کر باورچی خانے میں گئے اور باورچن سے سماوار گرم کرنے کو کہا۔ واپس آکر انہوں نے مجھے اپنی کتابیں دکھائیں۔ زیادہ تر کتابیں تو کسی نہ کسی سائنس سے متعلق تھیں مثلاً بکل، لائل، ہکسلی، لبک، ہیرہ مل، اسپنسر، ڈارون وغیرہ۔ روسی مصنفین بھی تھے مثلاً پیسارف، ڈوبرولیوبوف، چرنی شیفسکی، یوسپنسکی، نومچروف کی ''نرینکیٹ ملاقات'' اور نکراسوف کی نظمیں۔

ان کی چوڑی چوڑی مضبوط انگلیاں کتابوں کی جلدوں کو محبت سے سہلاتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں جیسے کسی بچے کو پیار کر رہی ہوں۔ جوشیلے لہجے میں دھیمے سے بڑبڑائے:

''کتنی اچھی کتابیں ہیں یہ سب! مثلاً اسے دیکھو — یہ کتاب ہے — سنسر نے اس کے جلائے جانے کا حکم دیا تھا — اگر تمہیں یہ معلوم کرنا ہو کہ ریاست دراصل کیا شے ہے تو اس کو پڑھو۔''

انہوں نے مجھے ہابس کی ''لیویاتھن'' دی۔

''یہ کتاب بھی ریاست کے متعلق ہے لیکن یہ ذرا ہلکی اور مزےدار ہے، رنگین سی۔''

یہ رنگین سی کتاب میکیاولی کی ''ریاست کا حکمران'' نکلی۔

چائے پیتے وقت انہوں نے مجھے اپنے متعلق مختصراً بتایا۔ وہ چرنیگوف کے رہنے والے ایک لوہار کے بیٹے تھے۔ کیئف کے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی کے پہیوں میں تیل دینے کا کام کرتے تھے۔ وہیں ان کی ملاقات انقلابیوں سے ہوئی اور انہوں نے ایک تعلیمی گروہ بنایا۔ پھر گرفتار ہو گئے اور تقریباً دو سال قید میں گزار کر دس سال کے لئے یاقوتسک علاقے میں جلاوطن کر دئے گئے۔

''جب اس یاقوت بستی میں مجھ کو رہنا پڑا تو شروع میں

تو میں سمجھا کہ بس اب خاتمہ ہوا۔ وہاں کی سردی! توبہ، لعنت ہے، ایسی کہ انسان کی کھوپڑی میں بھیجا جم جائے! ویسے بھی وہاں بھیجا ایک بے ضرورت چیز ہی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد مجھے یہ پتہ چلا کہ کہیں کہیں تھوڑے بہت روسی لوگ ضرور کیمپ میں تھے۔ ان کی تعداد کم تھی۔ دور دور ہی رکھے جاتے تھے لیکن تھے تو سہی۔ اس لئے ہم لوگوں کو تنہائی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ پھر حکومت اور زندہ روسیوں کو بھیجتی ہی چلی جا رہی تھی —— یہ اس کی بڑی مہربانی تھی! یہ روسی لوگ بڑے اچھے تھے۔ خاص طور پر ایک طالب علم تھا، جس کا نام ولادیمیر کورولینکو تھا۔ اس کی معیاد بھی میری معیاد کے فوراً ہی بعد ختم ہوئی۔ شروع میں وہ اور میں کچھ ایسے دوست نہیں تھے لیکن پھر ایک دوسرے سے ایک [illegible] گئے۔ ہم دونوں کی کوئی باتیں ملتی جلتی نہیں لیکن ملتی جلتی چیزوں پر دوستی زیادہ دن نہیں چلتی۔ لیکن وہ طالب علم بڑا جوشیلا اور مستقل مزاج تھا۔ ہر طرح کا کام وہ بڑی ہوشیاری سے کیا کرتا تھا، یہاں تک کہ صلیبی تصویریں پینٹ کرنے کی بھی اس نے کوشش کی۔ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی۔ اب وہ ادبی رسالوں کے لئے لکھتا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اچھا خاصا لکھ لیتا ہے۔۔۔

اس شام روماس بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے —— آدھی رات تک۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے اچھی طرح سمجھا دینا چاہتے تھے کہ میری جگہ ان کے ساتھ ہے۔ رفاقت کی ایسی سنجیدہ مسرت مجھے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ خود کشی کی کوشش کے بعد سے میں اپنی نظروں میں خود بہت گر گیا تھا اور اپنے آپ کو ایک بےکار اور بےمقصد مخلوق سمجھنے لگا تھا۔ ایک احساس جرم میرے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ زندہ رہتے شرم آتی تھی۔ روماس نے یقیناً اس بات کو بھانپ لیا ہوگا۔ بڑی سادگی مگر ہوشیاری سے

انھوں نے ہی زندگی کو میرے سامنے ہموار کر رکھا تھا اور اس طرح پوری میری زندگی میں توازن پیدا کر دیا — وہ دن مجھے کبھی نہیں بھولے گا!

اتوار کے دن کام ختم ہونے کے بعد ہم لوگوں نے دروازے کے لئے دونوں پٹ کھول دیے اور فوراً لوگ ہم لوگوں کے برآمدے میں جمع ہونے لگے — سب سے پہلے میرے دوستوں آئے — میلے، اجڑے، بکھرے، مزدوروں کے سے [illegible] لمبے [illegible] ہوئے، آنکھوں میں سوالات اور تھوڑی تھوڑی سی تشنگی۔ رومانوف سے سلام دعا کے بعد پوچھنے لگا ''کہئے، شہر کی کوئی نئی بات'' اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر، سامنے سے آتے ہوئے نوجوانوں سے مخاطب ہو گیا:

''ساتھیو! تمہاری محنتوں نے ایک اور مرحلہ طے کر دیا!''

پھر دوسرے ہی لمحے ہم لوگوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ لوہار صاحب کو قازان سے سینٹ پیٹرسبرگ لائے تھے، زار سے پہلے ورکشاپ کو اس بات پر راضی کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نوجوانوں کو منظم اور تربیت میں اکٹھا کر دیا جائے۔ اس نے لوہار کی تعریفیں کرنی شروع کیں:

''بڑا ہوشیار آدمی ہے! اپنے کام کی بات خوب سمجھتا ہے...''

رومانوف نے بڑے اطمینان سے کہا، ''یہ سب تم نے کھڑا کیا ہے، اپنے دل سے —''

''میں نے؟ وہ کب؟''

''اب یہ مجھے کیا معلوم...''

''میخائل، آپ تو کسی کی بات مانتے ہی نہیں ہیں''، ماریتوف نے افسردگی سے سر ہلا کر کہا۔ ''میں تو دوسروں پر خود ہی افسوس کر رہا ہوں — شہر میں بڑی مشکل سے دل لگتا ہے —''

ایک دبلا پتلا سا آدمی پرانا کوٹ پہنے آ پہنچا۔ صاف معلوم پڑتا تھا کہ یہ کوٹ پہلے کسی ڈیل ڈول والے کا رہا

موڈ — ہنستا ہوا وہ پاس آکے کھڑا ہو گیا — اس کے پھیکے ہونٹوں پر ایک گھبراہٹ سی طاری تھی — سیاہ لب ایک بیمار سی مسکراہٹ سے کھلے ہوئے تھے — بائیں آنکھ بار بار مار رہا تھا اور ہر بار آنکھوں کے اوپر چھدری سفید بھویں کانپ کانپ اٹھتی تھیں —

درنتوف نے مذاقیہ لہجے میں کہا ''میخون کا جام صحت نوش فرمائیو! تھو کل رات سے ہے تپ چڑھا ہوا،،

''تمہاری دوستی،، میخون نے پلٹ کر جواب دیا اور اپنی ٹوپی کی نوک کو ہاتھ سے لگا کر روسوں کو سلام کیا۔

ہمارا مالک مکان اور پڑوسی پانکوف باہر نکلا — شہر کی سی ہوئی جیکٹ، گلے میں سرخ رومال باندھا، جوتوں پر ربڑ کے گلوشیز* چڑھائے ہوئے اور گھٹنوں کے برابر لمبی چاندی کی زنجیر سینے پر آڑی سجی ہوئی۔ اس نے سختی سے میخون کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور بولا:

''اب کبھی میری کھڑکی کے نزدیک پھٹک کر دیکھ تو ذرا کیسے ڈنڈے رسید کرتا ہوں، بڈھے منحوس، شیطان!،،

میخون نے نہایت اطمینان سے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ''پھر وہی بات ـــــ اگر کسی کا سر نہ توڑا جائے تو زندگی نہایت پھیکی ہو جاتی ہے ــ،،

پانکوف اس پر زور زور سے بگڑنے لگا لیکن میخون اپنی ہی بات کہتا رہا:

''اور کون کہتا ہے کہ میں بڈھا ہوں — چھیالیس برس ـــــ بڈھا ہوا؟،،

---

* برف اور کیچڑ وغیرہ سے بچنے کے لئے جوتوں پر ربڑ کے جوتے چڑھا لئے جاتے ہیں — (مترجم)

"پچھلے کرسمس پر تو تمھاری عمر بیس سال تھی،" درسوف چیخا — "تم نے خود ہی کہا تھا کہ بیس برس کا ہوں — جھوٹ کیوں بولتے ہو؟"

اتنے میں سوسلوف بھی آپہنچا — (مجھے ان کسانوں کے خاندانی نام اب اچھی طرح یاد نہیں ہیں — ہو سکتا ہے بگڑ گئے ہوں یا آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہوں —) بوڑھا داڑھی والا چوڑا آدمی — یغور ابروف مچھیرا اور پھر اور لوگ — سب ملا کر کوئی دس ہوں گے — ہم دونوں دوکان کے دروازے کے سامنے برامدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور خاموشی سے ان کسانوں کی گفتگو سن رہے تھے جو برامدے کی سیڑھیوں پر یا دونوں طرف لگی ہوئی بنچوں پر بیٹھے تھے

اس دن بڑی گرد آلود سردی تھی — بادل تیزی سے نیچے آسمان پر دوڑے چلے جا رہے تھے اور یہ لگتا تھا کہ جاڑوں کے حملوں کے بعد اب تک سنبھلے نہیں ہیں — روشنی اور اندھیرے کے ٹکڑے جھیلوں اور جوہڑوں میں جابجا ابھرتے اور ڈوبتے دکھائی دیتے تھے — لڑکیاں تہوار کے چمکیلے کپڑے پہنے گلیوں سے نکلتی ہوئی وادی کی طرف جا رہی تھیں — جھیلوں کو پار کرتے وقت وہ اپنے دامنوں کو اوپر اٹھا لیتیں اور بھاری جوڑے کے سخت جوتے نظر آنے لگتے! ننھے ننھے لڑکے لمبی بنسیاں کندھوں پر ڈالے مچھلی کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے — کسان آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہماری دوکان کے پاس اکٹھے مجمع کو کنکھیوں سے دیکھتے اور خاموشی سے اپنی ٹوپیاں یا موٹی نمدے کی ہیٹوں کو انگلی سے چھوتے ہوئے نکل جاتے —

میکوف اور کوکوشکن اسی سوال پر بڑے مزے میں بحث کر رہے تھے جو کسی طرح طے ہی نہیں ہو چکا تھا: کون زیادہ زور سے ہنستا ہے —— سوداگر لوگ کہ زمیندار؛ کوکوشکن سوداگروں کی طرف سے بول رہا تھا اور میکوف زمینداروں کی طرف سے اور اس کی

گونجدار آواز کو کوکوشکن کی سہمی ہوئی آواز کو دباتے ہوئے بھی ''مسٹر نکروف کے جو بات تھی نا انہوں نے نپولین بونا پارٹ کی مونچھ پکڑ کر اسے کھینچ لیا تھا اور مسٹر فنگروف ـــــ وہ دو آدمیوں کو [illegible] کے [illegible] دونوں کو دو طرف الگ الگ اچھالتے ہیں اور پھر ان کا سر آپس میں ٹکرا دیتے ہیں — بس دونوں کا قصہ پاک!''

''یہاں [illegible] تو یو جیسے [illegible] کو [illegible] ہیں''

کوکوشکن نے [illegible] پھر بولا ''مگر کچھ بھی ہو — سوداگر لوگ کچھ زمینداروں سے زیادہ ہیں...''

سب سے اوپر والی سیڑھی پر وہ خوبصورت نوجوان [illegible] بڑبڑا رہا تھا:

''مسخ شدہ، ان کسانوں کے پیروں سے تو زمین نکلی جا رہی ہے۔ زمیندار ہیں جو [illegible] سمجھ کر وقت ضائع کرنے کی تو مہلت نہیں ملتی تھی — ہر ایک کے [illegible] اپنا کام تھا......''

''تو اب ایک درخواست دے دیجئے کہ کمروں کا نظام پھر سے رائج کر دیا جائے۔'' امروف نے نکتہ کو جواب دیا ـــ روماس نے خاموشی سے اسے گھورا اور برآمدے کے کناروں پر اپنی جانب گھومتے ہوئے [illegible] کو [illegible] اسے صاف کرنے لگے

میں انتظار کر رہا کہ اب وہ کچھ بولیں گے اور کسانوں کی الجھی ہوئی، بے ربط گفتگو کو غور سے سن کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ اب کھوکھول کیا کہیں گے۔ اب بھی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ بات چیت میں حصہ لینے کے کئی موقعوں کو انہوں نے ہاتھ سے نکل جانے دیا ـــــ لیکن وہ نہیں کہ بس ایک باوقار خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں [illegible] کی طرح خاموش وہ بیٹھے غور سے دیکھ رہے ہیں کہ ہوا کے جھونکوں سے جھیلوں میں لہریں پیدا ہو رہی ہیں اور ہوا بادلوں کو ایک بڑے سے سرمئی

تیر کی طرح اڑائے لئے جا رہی ہے۔ دریا کی طرف سے ایک اسٹیمر کی سیٹی کی آواز آ رہی تھی۔ ایک اکارڈین کے ساز پر دی ہوئی لڑکیوں کی سریلی آوازیں، ڈھلان پر سے ابھر ابھر کر اوپر کی طرف آ رہی تھیں۔ شراب کے نشے میں دھت ایک آدمی ہچکیاں لیتا، چیخیں مارتا گلی میں جا رہا تھا۔ اس کے بازو وحشیانہ انداز میں جھول جھول کر گھوم رہے تھے۔ پاؤں جسم کے وزن سے کچھ عجب طرح سے ٹیڑھے ہوتے جا رہے تھے۔ بار بار اس کے پاؤں کیچڑ میں جا پڑتے۔ کسان لوگ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ان کے الفاظ میں ایک ہلکی اداسی تھی۔ مجھ پر بھی اداسی کی مبہم سی کیفیت طاری ہو گئی تھی کیونکہ سرد آسمان اب بارش کی دھمکی دے رہا تھا اور میرا ذہن شہر کی مسلسل گہما گہمی کو یاد کر رہا تھا۔ مختلف آوازوں کا شور، گلی میں لوگوں کا تیزی سے آنا جانا، جلدی جلدی بات کرنا اور فکر انگیز الفاظ کی کثرت۔

جانے پر میں نے خوخول سے پوچھا کہ وہ کسانوں سے بات چیت کس وقت کرتے ہیں۔

"بات چیت! کس بات کے متعلق؟"

جب میں نے سمجھایا اور میرے سمجھانے کو وہ سنجیدہ توجہ کے ساتھ سن چکے تو بولے "اوہ، اچھا۔ دیکھو بات یہ ہے کہ اگر میں ان لوگوں سے ان چیزوں کے متعلق بات کروں اور وہ بھی دھر لیے گئے تو پھر میں یاقوتوں کے ساتھ رہنے کے لئے بھجوا دیا جاؤں....."

انہوں نے اپنی پائپ بھری اور اس کو سلگا کے ایسے کش کھینچے کہ ان کے چاروں طرف دھوئیں کے بادل لپٹ گئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بولنے لگے، "کچھ اس طریقے سے جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ انہوں نے کہا کہ کسان فطرتاً نہایت شکی مزاج ہوتا ہے۔ وہ

ہے اس پر شک کرتا ہے، اپنے پڑوسی پر شک کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ افسروں پر تو اور بھی زیادہ شک کرتا ہے — ابھی سو سال نہیں ہوئے ہیں کہ اسے آزادی ملی ہے — ہر کسان جس کی عمر چالیس سال ہے وہ سمجھو غلام پیدا ہوا تھا۔ مگر آزادی کے کیا معنی ہیں یہ بھی سمجھنا مشکل ہے — اگر ہم اس کو سادہ طریقے سے دیکھیں تو آزادی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ میں جیسے چاہوں ویسے رہوں، جہاں جدھر بھی مڑوں مڑ سکوں نہ کسی افسر سے ڈر ہو نہ ہی شہ، یہ حاکموں سے ہو جاتی ہے اور یہ سب کے سب جیسے چاہیں ویسے رہیں، کے اصول میں زندگی گزارتے ہیں — زار نے کسانوں کو زمینداروں سے چھڑوایا، اس لیے غالباً یہ سمجھا جاتا ہے کہ زار اب کسانوں کا واحد مالک ہے — لیکن پھر اس آزادی کے معنی کیا ہیں — ہو سکتا ہے کہ ایک دن — لیکن غیرمتوقع طور پر — زار اس بات کی وضاحت کر دے کہ اس کے معنی کیا ہیں — زار پر کسانوں کو بہت اعتماد ہے اور وہ اسے تمام زمین اور دولت کا واحد مالک سمجھتے ہیں — زار نے ہی کسان کو زمیندار سے چھڑایا، تو ہو سکتا ہے وہ سوداگروں سے جہاز اور دوکانیں بھی لے لے — چنانچہ ان سب خیالات کے تحت کسان زار کی طرف ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کئی مالک ہوں گے تو زیادہ کمبختی ہوگی، ایک ہی مالک رہے بلا سے۔ اور وہ اس دن کا انتظار کر رہا ہے جب زار اسے آزادی کی اصلی اہمیت سمجھائے گا — اور پھر ہر شخص جو چاہے گا لوٹ سکے گا۔ ہر شخص اس دن کے انتظار میں بیٹھا ہے — اور پھر بھی ہر شخص اس دن سے ڈرتا بھی ہے کیونکہ ہر ایک خفیہ طور سے دل ہی دل میں کانپ رہا ہے کہ دولت کی تقسیم کا وہ دن اس کے ہاتھ سے نکل نہ جائے — اور کسی کو اپنی صلاحیت پر بھروسہ نہیں — بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، حاصل کرنے کو ہے بھی بہت کچھ لیکن وہ کیسے اسے حاصل کرے — ہر شخص کو اسی چیز

کی خواہش ہے جس کی خواہش دوسرے کو ہے — پھر جدھر مڑو افسروں اور حاکموں کی کوئی انتہا نہیں جو ہمیشہ کسانوں کے بھی دشمن بنے رہتے ہیں اور زار کے بھی — وہ بغیر افسروں کے جی نہیں سکتا — وہ نہ ہوں تو عوام ایک دوسرے کا گلا دبا ڈالیں۔

ہوا غصے میں بھری ہوئی بہار کی بارش کو کھڑکیوں کے شیشے پر پٹک رہی تھی — باہر سیاہ سرمئی دھند چھائی ہوئی تھی — میرے دل میں بھی ایک غبار آلودہ دھند کی سی کیفیت تھی — روماس کی باوقار مدھم آواز فکرانگیز انداز میں کہتی جا رہی تھی:

"کسان کو یہ سمجھانا ہے کہ تھوڑا تھوڑا کرکے اسے زار کی طاقت اپنے ہاتھوں میں لینی ہے — یہ سمجھنا ہے کہ عوام کو اپنے ہی درمیان سے اپنے افسر اور گورنر انتخاب کرنے کا حق ہونا چاہئے —— اپنے کوتوال، اپنے گورنر اور اپنا زار بھی —"

"لیکن اس میں تو سو برس لگیں گے!"

"تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اگلے اتوار تک یہ کام پورا ہو جانا ہے؟" خوخول نے سنجیدگی سے پوچھا۔

شام کو وہ کہیں باہر تھے — گیارہ بجے کے قریب میں نے گلی میں اپنے مکان کے بالکل پاس گولی چلنے کی آواز سنی۔ اندھیرے اور بارش میں میں تیر کی طرح باہر بھاگا — دیکھا تو روماس پھاٹک پر پہنچ چکے تھے — ان کا بھاری سیاہ ہیولا بڑے اطمینان سے کیچڑ سے پاؤں بچاتا آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا —

"تم کیوں باہر نکلے؟ گولی تو میں نے چلائی....."

"کس پر؟"

"بھئی وہ پتہ نہیں کس طرح کے کچھ لوگ میرے پیچھے لگ گئے تھے — یہیں گلی میں — ڈنڈے بھی ان کے پاس تھے — میں نے ان سے کہا کہ ڈنڈے رکھ دیں ورنہ میں گولی چلاؤں گا —

اس کہنے کا کوئی اثر نہیں ہوا تو مجبوراً میں نے ہوا میں گولی چلائی — ہوا کا نہ بگڑنا تھا لوٹ گئے......

وہ کمرے میں داخل ہو کر اپنا بھیگا ہوا کوٹ اتارنے لگے۔ داڑھی سے پانی جھاڑا، سر ہلاتے جاتے، گھوڑے کی طرح ہوں ہوں کرتے جاتے "یہ میرے جوتے کمبخت! معلوم ہوتا ہے ان میں چھید ہو گئے ہیں۔ جاڑے گزریں گے۔ یہ لو ریوالور صاف کر لو ہے! ذرا مہربانی کرکے اسے صاف کر دو ورنہ زنگ لگ جائے گا۔ مٹی کا تیل مل دینا۔"

میں ان کی اس سنجیدگی اور اس خود اعتمادی پر دل ہی دل میں عش عش کرنے لگا۔ ان بھوری آنکھوں میں کس قدر ہمدردی اور کس درجہ استقلال تھا۔

ہم دونوں اندر گئے۔ آئینے کے سامنے داڑھی میں کنگھی کرتے ہوئے وہ بولے:

"جب گھر سے باہر جاؤ تو ذرا حفاظت سے کام لینا۔ خاص کر تہواروں کے دن اور رات کے وقت۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ تمہیں بھی ڈھونڈنے کی فکر میں ہوں گے۔ صرف یہ کرنا کہ لکڑی لے کر نہ نکلنا۔ اس طرح کی بات سے غنڈوں کو اور اشتعال ہوتا ہے اور ان کو یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ تم کو ڈر لگ رہا ہے۔ ویسے دراصل ڈرنے کی کوئی بات ہے بھی نہیں۔ یہ سب کے سب بزدل ہیں۔"

اب میرے لئے ایک خوشی کی زندگی کا دور شروع ہو گیا تھا۔ ہر دن اپنے ساتھ کوئی نئی اور اہم بات لاتا تھا۔ میں نے نیچرل سائنسوں کے متعلق جوش و خروش سے کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ روماس کا مشورہ تھا کہ "تم کو سب سے پہلے اور بہت زیادہ اچھی طرح اور غور سے یہی چیزیں پڑھنی چاہئیں۔ انسان کی بہترین منطقی قوت ان ہی سائنسوں کے اندر چھپی ہے۔"

ہفتے میں تین رات میں ایزوت کو پڑھنے لکھنے میں مدد دیتا

شروع شروع میں تو اس نے مجھے ذرا شبہ کی نظر سے دیکھا اور میری عادات کی طرف ذرا طنزیہ رویہ رکھا — لیکن چند سبقوں کے بعد مزے میں آکر کہنے لگا:

''واہ میاں لڑکے! تم تو واقعی خوب پڑھاکے ہو۔ تمھیں تو استاد بننا چاہئے تھا —— استاد!''

اور پھر یکایک اس نے تجویز پیش کر دی:

''دیکھو تم مضبوط تو خاصے لگتے ہو — آؤ ایک کھینچاتانی ہو جائے —''

ہم دونوں نے باورچی خانے سے ایک مضبوط سی لکڑی لی اور فرش پر بیٹھ گئے، پاؤں جوڑے اور دونوں نے لکڑی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا — کچھ دیر ہم دونوں خوب کوشش کرتے رہے کہ دیکھیں کون کس کو زمین پر سے اٹھاتا ہے — خوخول ہنس کے ہم دونوں کو خوب اکسا رہے تھے!

''شاباش، شاباش! ہاں، ہاں تو اسے، اٹھا لو!''

آخر کار ایزوف جیت گیا — اس نے مجھے اٹھا لیا اور پھر وہ اور بھی زیادہ مجھ پر مہربان ہو گیا۔ کہنے لگا ''کوئی بات نہیں — ویسے تم مضبوط کافی ہو — افسوس ہے کہ تمھیں مچھلی پکڑنے سے دلچسپی نہیں ورنہ میں تمھیں اپنے ساتھ والگا کے کنارے لے جاتا۔ والگا پر رات کے وقت تو بس جنت ہوتی ہے، جنت!''

وہ بڑی محنت سے پڑھتا تھا اور اچھی طرح ترقی کر رہا تھا۔ اپنے پڑھنے پر وہ خود ہی حیران رہ جاتا اور پھر حیرانی کے اس جذبے کو بڑے ہی دلکش طریقے سے بیان کرتا۔ کبھی کبھی وہ سبق کے درمیان سے اٹھتا اور ایک دم سے اچھل کر الماری سے یوں ہی کوئی کتاب نکال لیتا — اس کی بھویں تن جاتیں، آواز میں کوشش کا تناؤ آ جاتا، دو تین سطریں پڑھتا اور پھر اس کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو جاتا۔ میری طرف مڑ کر بڑے بھولے پن سے کہتا:

''ارے میں تو پڑھ لیتا ہوں — ایسی عجیب بات کبھی تم نے سنی ہے؟''

آنکھیں بند کرکے سطروں کو دوہرایا:

کھائی پر پرندہ یوں بیٹھا ہوا ہے
جیسے بیٹے کی قبر پر ماں

کئی مرتبہ اس نے بڑی احتیاط سے مدھم لہجے میں آہستہ سے پوچھا:

''کیا تم مجھے یہ نہیں سمجھا سکتے بھیا کہ یہ معاملہ ہو کیسے جاتا ہے — انسان ان ٹیڑھی میڑھی، گول گول ننھی سی لکیروں کو دیکھتا ہے اور وہ لفظ بن جاتی ہیں — اور میں ان لفظوں کو پڑھ بھی سکتا ہوں —— کمال ہے! یہ ہمارے اپنے ہی تو الفاظ ہیں جن کو ہم لوگ ہر وقت بولتے رہتے ہیں — لیکن وہ آخر مجھے معلوم کیسے ہوئے؟ کسی نے میرے کان میں تو پھونکے نہیں — اگر تصویریں ہوتیں تو پھر بھی سمجھ میں بات آسکتی تھی لیکن اس طرح تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میں کسی کے دل کی بات دیکھ رہا ہوں جو یہاں اس صفحے پر چھپی ہوئی ہے — یہ سب کیسے ہو جاتا ہے؟''

اب میں اس کو کیا جواب دیتا! ''مجھ کو نہیں معلوم'' جب میں نے یہ کہا تو اسے سخت مایوسی ہوئی — چھپا ہوا صفحہ روشنی کے بالکل قریب لاکر غور سے دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا ''تو پھر جادو ہوگا —''

اس شخص میں ایک خوشگوار اور دلکش بھولاپن تھا ایسا ستھرا اور شفاف جیسے بچوں کی معصومیت! اسے دیکھ کر میرے ذہن میں کتابوں کے تخیلی کسان کا تصور اور زیادہ ابھرتا جاتا تھا — اس کا مزاج شاعرانہ تھا جیسا عموماً مچھیروں کا ہوتا ہے اور اسے والگا،

رات کی پروقار خاموشی سے، تنہائی اور سناٹے سے اور غور و فکر کی زندگی سے عشق تھا —

ستاروں کی طرف نظر اٹھا کر وہ مجھ سے کہا کرتا:

''خوشحال رہنے میں [illegible] نہ ممکن ہے وہاں بھی لحظہ بلحظہ رہتے ہوں جیسے یہاں ہیں - تمہارا کیا خیال ہے؟ سب سے [illegible] خوشی کا اندازہ کر سکتے، ان سے مجھے ملتی کہ تمہاری نسل گذری ہے — تمہارا ہم [illegible] سے تو ہوں ہی تمہاری عمر کی —— زیادہ خوشی ہے —''

شادی طور پر وہ بھی زندگی سے مطمئن تھا — وہ سمجھتا تھا — شادی بیاہ ہوا نہیں تھا — بالکل آزاد، اپنے سب سے محبوب ٹکڑے میں مگن تھا — لیکن وہ اپنے سبھی دیہاتیوں سے نفرت بھی [illegible] اور مجھے ان سے خبردار کیا کرتا تھا:

''یہ ان کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آنا — لومڑیوں کی سی طبیعت ہے ان لوگوں کی [illegible] دھوکہ باز، فریب دینے والے — آج تمہیں ایک رخ دکھائیں گے تو کل بالکل بدل کر دوسرا — ان میں سے ہر ایک کو بس اپنی پڑی رہتی ہے - دوسروں کی نہیں — نہ عوام بھلائی کی یہ لوگ کوشش کرتے ہیں —''

دیہات کے امیروں کے متعلق وہ اپنی نفرت سے بات کرتا تھا جو اس کی نرم طبیعت کو دیکھتے بڑی عجیب لگتی تھی —

''آخر یہ دوسروں سے زیادہ امیر ہونے لگے، کیونکہ چالاک جو زیادہ ہیں — اچھی بات ہے — چالاک ہی تو جاتے ہیں جہنم میں! اور ایک بات اور یاد رکھیں کہ دیہات والوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ ایک گلے میں رہیں اور ایک دوسرے سے لڑیں نہیں — تب تو مضبوطی رہ سکتی ہے — لیکن اس کے بجائے وہ گاؤں بھر میں پھوٹ ڈالتے پھرتے ہیں — آگ میں ایندھن جھونکتے ہیں — یہ حرکت ہے ان کی — خود اپنے دشمن ہیں، بے ایمان کہیں کے — اب دیکھو

بچارے شوہروں کو کس قدر پریشان کر رہے ہیں!"

وہ خوبصورت اور معقول تھا اس لئے عورتیں اس پر بہت مرتی تھیں اور اکثر اسے اپنے گھر بلا لیتی تھیں — بڑے مزے سے وہ اس بات کو تسلیم کرتا:

"ہاں، ہاں — عورتیں میرا بے حد لاڈ کرکے میرا دماغ خراب کرتی ہیں اور ان کے شوہروں کو یہ اچھا نہیں لگتا — اگر میں ان شوہروں کی جگہ ہوتا تو مجھے بھی برا لگتا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اب شوہروں سے کیسے یہ اچھی طرح پیش آیا جائے — عورت تو گویا مرد کی دوسری روح ہوتی ہے — اور پھر یہ لوگ یعنی عورتیں جو زندگی بسر کرتی ہیں — نہ کوئی تفریح، نہ کبھی مہمانی بجز اس کے صبح سے شام تک نوکروں کی طرح کام کرنا — شوہروں کو وقت نہیں ملتا کہ ان سے پیار کریں — لیکن میں کھلی ہوئی ہوا کی طرح آزاد پھرتا — بہت سی تو ایسی ہوتی ہیں کہ شادی کو سال بھر ہوا کہ شوہر نے بوسوں کا مزہ چکھا دیا — ہاں میں ان کے ساتھ ذرا محبت کر لیتا ہوں اور بس — لیکن میں ان سے ایک بات یہ ضرور کہتا ہوں کہ یعنی ایک دوسرے سے خفا نہ ہو۔ میں تم سب کا خیال کر سکتا ہوں — آپس میں جلنے کا کیا معنی — میرے لئے تم سب برابر ہو کیونکہ مجھے تو سب سے ہمدردی ہے۔ سبھی کے لئے افسوس کرتا ہوں —"

پھر ذرا جھینپ کر اس نے اپنی بات جاری رکھی:

"میں نے ایک بار ایک بیگم صاحبہ کے ساتھ ناجائز تعلق قریب قائم ہی کر لیا تھا۔ وہ شہر کی بیگم تھی اور یہاں اس نے گرمیوں میں مکان لیا تھا — بہت خوبصورت تھی — جلد جیسے دودھ، بال جیسے سونا اور آنکھیں نیلی، ایسی نیلی کہ کیا بتاؤں، اور ان آنکھوں میں شفقت اور پیار جھلکتا تھا — میں اس کے یہاں مچھلی بیچنے جایا کرتا تھا اور ہر بار بھی اس کی صورت سے نظریں نہیں ہٹا سکتا تھا

وہ کہتی ''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' میں کہتا ''آپ تو خود ہی جانتی ہیں —'' پھر اس نے کہا ''اچھا، یہی سہی۔ میں آج کی رات تمہارے پاس آؤں گی — انتظار کرنا —'' اور وہ مشکل آ بھی گئی لیکن بس یہ ہوا کہ مچھروں نے اس کو پریشان کرنا شروع کر دیا — تو پھر ہم دونوں سے کچھ ہو ہی نہیں سکا — وہ کہتی ''یہ مچھر کس بری طرح کاٹتے ہیں — مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکتی —'' اور وہ تقریباً رونے لگی — دوسرے دن اس کا شوہر آ گیا۔ کوئی حرج تھا وہ — یہاں ان مچھروں کی بھی تو بات ہے —'' ایزوف نے افسردہ ملامت کے ساتھ کہا ''مچھر تک ان کی زندگی کو تباہ کر سکتے ہیں —''

لوکوشکن کا ذکر وہ بڑی معذرتوں کے ساتھ کرتا تھا:

''یہ دیکھو ذرا! یہ شخص شہ زور ہے اور سچ مچ ایک دل والا آدمی — لوگ اس کو پسند نہیں کرتے مگر لوگ غلطی کرتے ہیں — ویسے کچھ مغرور ہے مگر پھر اس میں عیب کون سا ہے۔''

لوکوشکن کے پاس اپنی زمین نہیں تھی — پانکوف کی زمین پر مزدوری کرتا تھا — اس کی بیوی بھی کسان مزدور تھی — شہرا کی عورت، چھوٹا سا قد، لیکن بڑی مضبوط، بھرپور اور مزاج کی خوب تیز — ان لوگوں نے اپنا مکان ایک سوداگر کو کرائے پر دے رکھا تھا اور خود اپنے مکان کے حصہ میں رہتے تھے — لوکوشکن کو نئی نئی خبریں سننے اور عجائبات کی ٹوہ لینے کا جنون تھا — اگر کوئی نئی خبر نہ ملتی تو وہ خود خبریں گڑھتا جو عام طور پر ایک ہی قسم کی ہوتی تھیں —

''آپ نے کچھ سنا میخائلچ، یہ جو سکوف کا کوتوال تھا نا اس نے اب قسم کھا لی ہے کہ راہب بن جائے گا اور اپنی نوکری چھوڑ دے گا — کہتا ہے بستی میں اب گناہوں کو زیادہ نہیں سہہ سکتا — بس بہت سہہ چکا!''

خوخول مخلص سنجیدگی سے جواب دیے:

''اگر ایسا ہی ہوتا رہا تو پھر تو بہت جلد سارے افسر ازنجہو ہو جائیں گے —''

کولوسکی نے الجھے بالوں میں سے کنگھی، تنکے اور مرغول کے پر وغیرہ نکالتے ہوئے اس تجویز پر غور کیا:

''نہیں — یہ تو میں نہیں کہوں گی کہ سب — مگر ہاں جن کے حوصلہ بہت ضرور ہے ان کے لئے تو اتنی یہ جو لڑکی بڑی مشکل میں ہے — تو سمجھتے ہیں نا — وہ تو مجھے عمر ہی رہتا ہے کہ اب نہیں ملے — پھر بھی انسان شوہر کے بغیر کیسے زندہ رہ سکتا ہے — میں تو ایسے آدمی کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں کیا کرتی وہ کتنا ہی لائق کیوں نہ ہو — اب بھی پچھلے ایک خاتون تھیں ...''

اور پھر اس نے ایک داستان شروع کر دی جو کسی بہت ہی ''ہردلعزیز'' کی صاحبزادی، عمل دار عورت سے متعلق تھی —

''وہ بھی بدمعاش، ایسی مانتی ہی نہ کہ گورنر تک اس سے ملنے آیا — وہ ایسا بڑا آدمی ہے اور ایسی اس کی پوزیشن ہے پھر بھی آیا۔ اور وہ کہتا ہے ''مادام اب ذرا احتیاط برتیں، کیونکہ'' وہ کہتا ہے ''کیونکہ آپ کے کارناموں کی افواہیں یہاں سے لے کر سنٹ پیٹرس برگ تک پہنچ گئی ہیں —'' تو میں بتا رہی ہوں کہ اس نے گورنر کے لئے خوب شراب پلائی مگر کہا بس اتنا ہی کہ آپ ڈھونڈتے پھر جائیے، میں اپنی فطرت نہیں بدل سکتی — تین سال اور ایک مہینہ گذر گیا، پھر اچانک اس نے اپنے سب کسانوں کو بلایا اور بولی ''لو، میری یہ سب زمین لے لو — اور خدا حافظ، اور مجھے معاف کرو، میں جا رہی ہوں —''

''کہاں جانے کے لئے ...'' خوخول نے بیچ میں ٹکڑا لگایا —

کولوسکی نے غور سے اس کو دیکھا اور حامی بھرتے ہوئے سر ہلایا:

"جی ہاں — ٹھیک ہے — وہ جا کر بڑی سی بن گئی — تو آپ نے بھی اس کے متعلق سنا ہے؟"

"نہیں — میں نے تو اس طرح کی کوئی بات کبھی نہیں سنی —"

"تو پھر آپ کیسے جانتے ہیں؟"

"میں تم کو جو جانتا ہوں —"

بیچارہ خیالی پلاؤ پکانے والا تاسف سے اپنا سر ہلاتے کہتا:

"آپ تو کبھی کسی کی بات مانتے ہی نہیں ہیں —"

اس طرح برابر ہوا کرتا — اس کی داستانوں میں عقلمند جو ہوتے اور بڑے لوگ ہوا کرتے تھے وہ آخرکار ہرنی کرتے کرتے ہلاک [illegible] کرتے تھے اور غائب ہو جایا کرتے تھے — یا اکثر وہ ان کو کسی خانقاہ وغیرہ میں رکھا دیا کرتا تھا جیسے گھوڑے کو اپنا کر گھوڑے پر پھینک دیا جائے — اس کے دماغ میں عجیب عجیب اور غیرمعمولی خیالات آیا کرتے تھے — پیشانی پر بل ڈال کر اچانک اعلان کرتا:

"ہم نے سفر تقاریبوں کو فتح کیا ہے تاتاری ہم سے زیادہ اچھے انسان ہیں —" اور یہ بات اس وقت کہی جاتی جب تاتاری کا کہیں ذکر نہ ہوتا بلکہ اس وقت پھل پیدا کرنے والوں کی سطحی انجمن بنانے کی گفتگو ہو رہی ہوتی — یا جب روماس سائبیریا کے اور وہاں کے رہنے والے، کب سے پہلے کسانوں کا ذکر کرتے ہوئے تو کوکوشکن دماغ پر زور ڈال کے اور بہت سوچ کے ایک دم سے کہتا:

"اگر ہیرنگ مچھلی کا شکار دو تین سال نہ کیا جائے تو ان کی تعداد اتنی بڑھ سکتی ہے کہ سمندر سب بھر جائیں اور پھر ایک طوفان نوح آ جائے — حیرت ہے کہ مچھلیاں بھی کس قدر جلدی بڑھتی ہیں!"

گاؤں میں سب اس کو ایک بےکار اور چھچھورا آدمی سمجھتے تھے — اس کی کہانیاں اور عجیب وغریب خیالات سے کسانوں کو

جڑ سہی۔ پھر بھی اگرچہ وہ اس کو چڑاتے، کوستے، لیکن اس کی بات غور اور دلچسپی سے سنتے جیسے اس بات کی امید رکھتے ہوں کہ اس کے خیالی پلاؤ اور ہوائی قلعوں میں کچھ سچائی کا شائبہ نکل آئے گا۔ شریف لوگ اس کو کہتے "غبارہ ہے —— بس پھونک بھری ہوئی ہے —"

خود بانکوف کہتا "انسان کو جیبوں میں ناپا جاتا ہے"

کوزینسکن بڑا حوصلوں والا مزدور تھا — وہ ہمیشہ منافع کا کوئی کام کرتا تھا۔ اسٹوں کے سمور بیچتا تھا، شہد کی مکھیاں پالنے کے طور طریقے جانتا تھا، عورتوں کو مرغیاں بیچتا، بکریاں اور بڑھئی کا کام بڑی خوشی سے کرتا تھا — وہ جو کام شروع میں اچھا لگتا تھا اس کا خوشی کے ساتھ پورا ہو جانا یقینی تھا اگرچہ وہ آہستہ آہستہ اور بے دلی سے کام کرتا تھا — اسے بلیوں کا شوق تھا اور کوئی دس بلیاں تو اس کے یہاں پلی ہوئی تھیں۔ اچھی خاصی جیسے جنگلی شکاری جانور ہوتے ہیں — وہ ان کو اپنے حمام میں رکھتا تھا اور ان کے کھانے کے لئے شکرے اور مینائیں پکڑ کر لایا کرتا تھا — اس طرح اس نے ان کو چڑیاں کھانے کا عادی بنا دیا تھا جس سے گاؤں والے اس سے چڑھتے تھے کیونکہ وہ بس پڑوس کی مرغیاں اور چوزے پکڑ کے کھا جایا کرتی تھیں۔ عورتیں انسان کی ان بلیوں کی تلاش میں رہتی تھیں اور ان کو پکڑ کر بری طرح مار ڈالتی تھیں۔ اکثر اس کے حمام میں لڑتے ہوئے پڑوسیوں کی چیخ پکار بھی رہتی لیکن اس پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا:

"بے وقوف سب کے سب! ارے بلیاں تو شکاری جانور ہوتی ہی ہیں — کتوں سے کچھ کم تھوڑی۔ جب میں ان بلیوں کو چڑیوں کا شکار کرنا سکھا دوں گا تو پھر ہم لوگ بلیوں کی نسل کی نسل پالیں گے —— سینکڑوں —— پھر ان کو بیچیں گے — اور اس کے معنی ہیں جیب میں پیسے — بے وقوف کہیں کے!"

اس نے ایک بار پڑھنا لکھنا سیکھا تھا لیکن اب اسے اس فن کے متعلق کچھ یاد نہ تھا اور نہ ہی اسے اپنی یادداشت کو تازہ کرنے کی خواہش تھی — فطری طور پر وہ ذہین اور تیز تھا — اس نے خوخول کی گفتگو کے اہم نکتوں کو دوسروں سے جلدی سمجھ جاتا تھا — اپنا منہ سکوڑتا جیسے کسی نے کڑوی دوا کی ایک خوراک پی لی ہو اور کہتا ''تو ایوان خوفناک بھی چھوٹے آدمیوں کا کوئی دشمن نہیں تھا — ''

کوکوشکن، ایزوب اور پانکوف اکثر شام کو آتے اور کافی رات گئے تک بیٹھتے خوخول کی باتیں سنتے رہتے دنیا کے نظام کے متعلق، باہری ملکوں کی زندگی کے متعلق، عوام کے اٹھائے ہوئے انقلابی ہنگاموں کے متعلق — پانکوف کو انقلابِ فرانس بےحد پسند تھا — نہایت معترف ہو کے کہتا:

''ہاں —— یہ ہوئی واقعی زمانے کی کروٹ!''

تقریباً دو سال پہلے پانکوف نے جائداد میں سے اپنا حصہ اپنے باپ سے طلب کیا تھا — اس کا باپ امیر کسان تھا، بڑی بڑی خوفناک آنکھیں تھیں جو ابلی پڑتی تھیں — اپنا حصہ لے کر پانکوف نے اپنی ایک آزاد زندگی بنا لی تھی، ''محبت کرکے'' ایک یتیم لڑکی سے شادی کر لی تھی جو ایزوت کی بھتیجی لگتی تھی — وہ اپنی بیوی کو بہت دباؤ میں رکھتا تھا لیکن کپڑے وغیرہ اس کو شہر کے سے نئے نئے فیشنوں کے پہناتا تھا — پانکوف کا باپ اس علیحدگی پر اس کو کوستا تھا اور جب اپنے بیٹے کے نئے مکان کے پاس سے گذرتا تو زور سے تھوکتا — گاؤں کے امیر اور کھاتے پیتے لوگ پانکوف سے اس بات پر بہت ناراض تھے کہ اس نے اپنا مکان روماس کو کرائے پر دے دیا تھا اور سامنے اس کی دوکان کے لئے سائبان بھی ڈلوا دیا تھا — وہ اس بات پر پانکوف سے نفرت کرتے تھے لیکن وہ بظاہر ان کی نفرت کی پرواہ نہیں کرتا تھا — وہ ان کا ذکر حقارت سے کرتا تھا — لیکن ان سے

بس کرتا تو سمجھی ہے مگر ہنس ہنس کر — اسے گاؤں کی زندگی سے شدید نفرت تھی — اکثر کہا کرتا:

''اگر مجھے کوئی مسئلہ، کوئی ہنر آتا تو میں جا کر شہر میں رہتا...،،

اس کا جسم بہت متناسب تھا، مضبوط تھا اور وہ کپڑے ہمیشہ صاف ستھرے پہنا کرتے وقت اور سنجیدگی سے رہتا اور اس وقت تو سنجیدگی سے کافی زرخیز — ضعیف لگتی تھی — روماس سے پوچھتا:

''یہ سب اس طرح کے دہقان کیوں کرتے ہیں: دل کی وجہ سے کہ دماغ کی؟،،

''تمہارا کیا خیال ہے؟،،

''مجھے کیا معلوم؟ آپ بتائیے —،،

''لیکن تمہارے خیال میں کس کی بات ماننا بہتر ہے — دل کی کہ دماغ کی؟،،

''مجھے کیا معلوم؟ آپ بتائیے — آپ کا کیا خیال ہے کس کی؟،،

خوخول بھی ضدی ہے — آخر وہ اس انسان سے دل کی بات کہوا کے ہی چھوڑتے —

''دماغ کی — بالکل — بہتر طریقہ تو یہی ہے — دماغ انسان کو فائدے کے خیال کے بغیر کوئی کام نہیں کرنے دیتا اور اسی سے کچھ حاصل بھی ہوتا ہے — کوئی ٹھوس چیز — لیکن دل کی بات مانو تو وہ بڑا متغیر ہے — اگر دل کی بات مانوں تو پھر تو ایسی مصیبت میں پڑوں کہ توبہ! یقیناً سب سے پہلے تو پادری صاحب کے گھر میں آگ لگا دوں تاکہ اسے یہ سبق سکھاؤں کہ خوامخواہ ہر جگہ جہاں اس کی ضرورت نہیں ہے وہاں اپنی ناک نہ گھسیڑتا پھرے —،،

یہ پادری صاحب ایک نہایت کمینہ فطرت آدمی تھے، چھوٹا سا، نکیلا سا منہ — اور انہوں نے پانکوف کو خاص طور پر اپنا مخالف

[illegible] تھا کیونکہ جب ہانکوف کی اپنے ہاتھ سے بڑائی ہوتی تھی تو وہ بیچ میں پڑے تھے—

شروع میں تو ہانکوف نے میری طرف بھی [illegible] دشمنوں کا سا رویہ رکھا۔ [illegible] لیکن [illegible] اور میں بھی [illegible] کہ میری طرف سے بھی [illegible] برابر سے ملتا تھا— ترکی بہ ترکی!

وہ [illegible] میری [illegible] میں [illegible] مزدور ہیں— [illegible] چوبی دیواروں والے کمرے میں [illegible] کمرے میں ایک میز پر لیمپ جلتا رہتا تھا اور لیمپ کے پیچھے [illegible] بھاری بھرکم انسان کی ہستی! [illegible] کی نوکیلی داڑھی اور اوپر کو اٹھا ہوا، آگے کو نکلا ہوا ماتھا، اور وہ کہتے جاتا:

''زندگی میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسان جانوروں سے آگے، اور آگے، اور آگے بڑھتا جائے....

تینوں [illegible] عورتیں اس کی بات سنتے ہوئے۔ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی، چہرے پر دہشت برستی ہوئی! [illegible] ہمیشہ بالکل خاموش رہتا جیسے دور سے آتی ہوئی کسی ایسی آواز پر کان لگائے ہوئے ہے جس کو صرف وہی سن رہا ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں سن پا رہا ہے— کوکوشکن اس طرح بار بار پہلو بدلتا جیسے اسے مچھر کاٹ رہے ہوں۔ ہانکوف اپنی چھوٹی سی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کسی خیال کے تحت آہستہ آہستہ کہتے جاتا:

''تو آخر کار اس بات کی ضرورت پڑی کہ لوگوں کو صنفوں میں تقسیم کیا جائے—''

ہانکوف کی ایک بات ایسی بھی جس کا میں بہت معترف تھا— وہ اپنے مزدور کوکوشکن سے کبھی بری طرح نہیں پیش آتا تھا

اور اس کے خیالی پلاؤ اور ہوائی قلعوں کی باتوں کو وہ ہمیشہ توجہ سے سن لیا کرتا تھا۔

شاہ کی اس گفتگو اور اس بیٹھک کے بعد میں اپنے کوٹھے والے کمرے میں چلا جاتا اور دیر تک کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر سوئے ہوئے گاؤں اور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کو دیکھتا رہتا جہاں خاموشی کا راج ہوتا۔ دمکتے ہوئے ستارے رات کی تاریکی کو چیرتے ہوئے جتنا زیادہ مجھ سے دور ہوتے اتنا ہی زیادہ زمین کے نزدیک لگتے۔ اس پروقار خاموشی میں میرا دل جیسے بھنچنے اور سکڑنے لگتا، خیالات اڑ کر خلا کی وسعتوں میں گم ہو جاتے جہاں ہزاروں گاؤں پڑے ہیں، ہمارے ہی اس گاؤں کی مانند، زمین کی سپاٹ چھاتی سے لگے ہوئے۔ چاروں طرف ہر شے بے حس و حرکت اور خاموش۔

یہ تاریک خلا مجھے اپنی گرم آغوش میں بھینچ لیتا اور یہاں تک مجھ سے لپٹتا کہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے میری روح میں ہزاروں جونکیں لپٹی ہوئی ہیں، مجھ پر غنودگی کا عالم طاری ہو جاتا، ایک مبہم سی بے چینی دل کو اندر ہی اندر کھاتی جاتی۔ ہماری اس وسیع دنیا کے دیکھتے میرا اپنا وجود کس قدر کم مایہ، کس قدر حقیر تھا...

گاؤں کی زندگی مجھے بے مسرت دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اکثر سنا اور پڑھا تھا کہ گاؤں کی زندگی شہر سے زیادہ صحت مند اور میل ملاپ والی ہوتی ہے لیکن میں یہاں دیکھتا تھا کہ کسان لوگ مسلسل ایسی محنت کرتے رہتے تھے جو ان کو بالکل پیس پیس ڈالتی تھی۔ بہت سے ان میں سے بیمار اور مریل تھے، بہت سے مسلسل جانفشاں محنت کی وجہ سے عمر بھر کو مفلوج ہو چکے تھے۔ مشکل سے ان کسانوں میں کوئی ہشاش بشاش چہرہ نظر آتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ شہر کے مزدوروں پر بھی محنت ان لوگوں سے کچھ

کم نہیں پڑتی تھی — لیکن وہ یقیناً خوش زیادہ رہتے تھے، تفریح زیادہ کرتے تھے اور ان بسورتے ہوئے دیہاتیوں کی طرح ہر وقت تھکے ہوئے انداز میں زندگی کا رونا نہیں روتے رہتے تھے — مجھے صاف بسا نظر آنے لگا تھا کہ کسان کی زندگی کوئی آسان زندگی نہیں ہے — زمین پر مسلسل اور بےحد توجہ دینی پڑتی ہے اور آپس میں ایک دوسرے سے برتاؤ اور کاروباری بات‌چیت کرنے میں بڑی چالاکی سے کام لینا پڑتا تھا — یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس بیلوں جیسے بدھوپن کی زندگی میں صحت مندی کہاں تھی — مجھے تو معلوم ہوتا تھا کہ گاؤں کے سارے ہی لوگ اندھوں کی طرح ٹٹولتے ہوئے، گویا ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی چیز سے ڈرا ہوا ہے، سب ایک دوسرے پر شک اور شبہ کر رہے ہیں —— کچھ بھیڑیوں کی سی خاصیتیں ان میں جان پڑتی تھیں —

یہ بھی سمجھنا میرے لئے بڑا مشکل تھا کہ آخر یہ سب خوخول اور ہانکوف اور ہمارے ساتھیوں سے کیوں نفرت کرتے تھے — آخر ہم لوگ یہی تو چاہتے تھے کہ نظام زندگی کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر پھر سے تعمیر کیا جائے —

اب مجھے صاف نظر آتا تھا کہ شہر کو گاؤں کے بہ‌نسبت کیا حاصل تھا —— مسرت حاصل کرنے کی تلاش، ہمت اور جرأت‌والی ذہنیت، مقاصد اور مسائل کا مختلف‌النوع ہونا — اور ایسی راتوں میں ہمیشہ مجھے شہر کے دو خاص لوگ یاد آتے تھے:

”ف — کالوگن اور ز — نیپے“

”دستی و دیواری و دیگر قسم کی گھڑیوں کی مرمت — ہمارے یہاں مختلف قسم کے آلات کی مرمت بھی کی جاتی ہے — سرجری کے تمام آلات، سینے کی مشینیں، چاہے وہ کسی کمپنی کی ہوں و دیگر آلات یہاں بخوبی‌وبکفایت مرمت کئے جاتے ہیں —“

یہ سائن بورڈ ایک تنگ سے دروازے پر لگا تھا جو ایک ننھی سی دوکان کی دو گردآلود کھڑکیوں کے درمیان کھلتا تھا۔ ان میں سے ایک کھڑکی میں دولہا سجا تھا — گٹھیلا جسم، گول چہرہ جو ہر وقت ہی مسکراتا رہتا۔ اس کی بیوی، صاف چکنی چندیا پر ایک بڑا سا گومڑا تھا، ایک آنکھ پر خمیدہ مگر شستہ تہ ہوا — نیچی گلابی رنگ کی باریک سی چھینٹ سے کپڑوں کے آلات بنتے، ان میں لپٹے ہوئے وہ نظر آتا۔ مونچھ کی سخت جھالر کے نیچے دہانہ نہیں تھا۔ دوسری کھڑکی کے پاس تھے سجا ہوا — دبلا پتلا آدمی، سخت رکھے سینکوں جیسے بال، نکیلی داڑھی، طوطے کی سی ناک، خوب بڑی سی سیاہ آنکھیں، زیتون کی طرح ہری ہری؛ فی الجملہ وہ ایسا لگتا جیسے تصویروں میں شیطان بنائے جاتے ہیں — وہ بھی ہر وقت ننھے ننھے اوزاروں کی اٹھا دھری، تبدیل موند میں مصروف نظر آتا — لیکن کبھی کبھی وہ بھی لوچدار بھدی آواز میں چلانے لگتا:

”ترارا، تام، تام، تام!“

ان دونوں کے پیچھے گونا گوں سامان کی جھلک مجھے بھی دکھائی دیتی تھی — موم بتیوں کی بستیاں، طرح طرح کی مشینیں، فانوس، جھنڈے، باجے، اسکولوں کے گلوب وغیرہ — الماریوں میں عجیب و غریب شکلوں کے اوزار کے سامان، وزنے وغیرہ رکھے رہتے تھے — دیواروں پر قسم قسم کی گھڑیاں لٹکی رہتیں اور ان کے پنڈولم جھولا کرتے — اگر میرا لمبا چوڑا جسم روشنی نہ روکتا تو میں تو گھنٹوں وہاں کھڑا رہتا اور ان لوگوں کو کام کرتے دیکھتا۔ لیکن میرے کھڑے ہونے سے روشنی رکتی تھی اور یہ مستری لوگ برا سا منہ بنا کر ہاتھ سے مجھے ہٹ جانے کا اشارہ کرتے — میں وہاں سے ہٹ جاتا اور جاتے جاتے سوچتا جاتا کہ کوئی بھی کام کر سکنے کی قابلیت کتنی بڑی خوش نصیبی ہے —

میں ان لوگوں کی دل سے عزت کرتا تھا اور اس بات پر میرا

پکا ایمان تھا کہ ان لوگوں کو ہر طرح کی مشینوں اور آلات اور اوزاروں کے سارے راز معلوم ہیں، کہ وہ دنیا کی ہر ٹوٹی ہوئی چیز کی مرمت کر سکتے ہیں — یہ ہیں واقعی آدمی!

لیکن گاؤں کی زندگی مجھے پسند نہ تھی — کسانوں کو سمجھنا میرے لئے بڑا مشکل تھا — عورتیں تو ہر وقت اور مسلسل بیماری کا رونا رویا کرتی تھیں — کبھی "دل ڈوب رہا ہے"، تو کبھی "کلیجہ جل رہا ہے" — اور پیٹ میں اینٹھن تو ہر وقت ہوا کرتی — جب عورتیں اتوار کو یا کسی چھٹی کے دن والگا کے کنارے جمع ہوتیں یا اپنے گھروں کے سامنے سیڑھیوں پر بیٹھتیں تو کسی موضوع کے مقابلے میں اس موضوع اور ان امراض پر سب سے زیادہ توجہ اور دلچسپی سے بحث ہوتی — سب ہی کسان بے حد چڑچڑے تھے اور ذرا ذرا سی بات پر ہی گھونسے پر اتر آتے تھے — ایک مرتبہ مٹی کے ایک چٹخے ہوئے جگ پر جس کی قیمت (جب وہ نیا رہا ہوگا تب) مشکل سے بیس کوپک رہی ہوگی، تین خاندانوں میں بھی لاٹھی چل گئی — اور لڑائی ختم ہوتے ہوتے ایک بڑھیا کا ہاتھ ٹوٹ گیا اور ایک نوجوان کی کھوپڑی ٹوٹی تھی — شاذ ہی کوئی ہفتہ گذرتا ہوگا جب اس قسم کی لڑائیاں جھگڑے نہ ہوتے ہوں۔

نوجوان لڑکیوں سے بڑی بے ہودہ فحاشی سے پیش آتے اور ان کو طرح طرح سے پریشان کرتے — کسی لڑکی کو کھیت میں پکڑ لیتے اور اس کا سایہ سر تک الٹ کر اوپر سے مونج سے باندھ دیتے — یہ "گلدستہ بنانا" کہلاتا تھا — لڑکیاں کمر تک ننگی ہو کر خوب چیختیں، چلاتیں، کوستیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کھیل انہیں بھی بہت زیادہ ناپسند نہیں تھا — کم از کم اپنے بندھنوں کو کھولنے یا توڑنے میں کچھ ایسی زیادہ جلدی نہیں کرتی تھیں — گرجا گھر میں رات کی عبادت کے وقت نوجوان لڑکیوں کے کولہے اور کمر میں چٹکیاں کاٹنے میں اس طرح مصروف

رہتے تھے گویا اسی کام کے لئے گرجا گھر آئے ہوں — اتوار کے دن پادری صاحب منبر پر سے ان کو نصیحت فضیحت کرتے:

”جانورو، وحشیو! کیا اپنی فحاشی بدمعاشی کے لئے تمہیں اور کہیں جگہ نہیں ملتی؟“

روماس نے مجھے بتایا:

”یوکرین میں لوگ زیادہ شاعرانہ طریقے پر مذہبی ہیں — یہاں تو میں دیکھتا ہوں کہ خدا پر ایمان کی تہہ میں صرف لالچ اور خوف کے کھردرے جذبات ہیں — جہاں تک دل سے خدا کی محبت کا سوال ہے وہ تمہیں یہاں کے لوگوں میں نہیں ملے گی — ممکن ہے یہ بات بہتر ہی ہو — اس کیفیت میں یہ لوگ جلدی مذہب سے چھٹکارا پا جائیں گے — اور یہ مذہب جو ہے یہ نہایت مہلک رجحان ہے، نہایت ہی مہلک تعصب — میں تمہیں یقین دلا سکتا ہوں!“

دیہات کے نوجوان شیخی خورے اور اینٹھو بھی تھے لیکن بزدل — اب تک تین بار وہ رات کے اندھیرے میں مجھه پر حملے کر چکے تھے لیکن ناکام رہے — صرف ایک بار ایک ڈنڈا میری ٹانگ میں لگا تھا — ظاہر ہے کہ میں نے ان جھڑپوں کے بارے میں روماس سے کچھه نہیں کہا لیکن اس دن ٹانگ میں جو چوٹ لگی تو مجھے لنگڑاتے دیکھه کر وہ سمجھه گئے۔

”کیوں؟ چکھه لیا مزہ؟ میں نے کہا تھا نا کہ ہشیار رہنا!“

اگرچہ انہوں نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ رات گئے گاؤں میں ادھر ادھر نہ گھوموں لیکن میں پیچھے والے سبزی کے باغ سے نکل کر والگا کے کنارے پر پہنچ جاتا تھا اور وہاں بید کی جھاڑیوں میں بیٹھا، رات کی شفاف نقاب کے پار دوسرے کنارے کی نچلی وادیوں کو دیکھا کرتا — والگا میرے سامنے آہستہ آہستہ شاہانہ انداز میں بہتا رہتا اور چھپے ہوئے سورج کی شعاعیں چاند کا عکس بن

کر اس کے پانی میں چاندنی برسانی رہیں — مجھے چاند پسند نہیں تھا بلکہ کچھ منحوس سا لگتا تھا — کتوں کی طرح مجھے بھی اس کی روشنی میں اداسی محسوس ہوتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ سر اٹھا کر زور زور سے روؤں — اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ چاند کی روشنی اس کی اپنی روشنی نہیں ہے، چاند تو مردہ ہے، اس پر زندگی کے آثار نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں —— تو مجھے بہت خوشی ہوئی — جب تک مجھے یہ بات معلوم نہ ہوئی تھی اس وقت تک میں اپنے تخیل میں یہ سمجھتا تھا کہ چاند میں تانبے کے بنے ہوئے لوگ رہتے ہوں گے — ان کے جسم مثلث کی طرح تکونے ہوں گے، لمبی لمبی کمپاس کی سی ٹانگیں ہوں گی جو چلنے میں اس طرح بجتی ہوں گی جیسے روزوں کے زمانے میں گرجا کی گھنٹیاں بجتی ہیں — چاند پر تمام چیزیں تانبے کی ہی بنی ہوتی ہیں اور ہر چیز —— سبزیاں، جانور —— ہر چیز مسلسل بجتی رہتی ہوگی — وہاں ہر شے ہماری زمین کی دشمن ہے اور ہر چیز ہماری دنیا کے خلاف سازش کرتی ہے — لہذا ظاہر ہے یہ بات کس قدر اچھی لگی کہ چاند تو صرف آسمان میں ایک شے بے کار ہے — پھر بھی اچھا ہوتا اگر کوئی بڑا ستارہ چاند سے ٹکرا جاتا کہ اس میں آگ لگ جاتی اور پھر ہم دنیا والے چاند کی اصل روشنی کو دیکھتے —

دریا کے کنارے بیٹھ کر میں دیکھتا کہ آہستہ آہستہ ڈوبتی ہوئی لہریں چاند کی روشنی کی زربفت پٹی کو جھولا جھلا رہی ہیں — دور دھند میں سے یہ لہریں نکلتیں اور کھردرے ساحل کی تاریک پرچھائیوں میں گم ہو جاتیں اور یہ دیکھتے دیکھتے میں اپنے آپ میں جیسے ایک نئی ذہنی طاقت ابھرتی ہوئی محسوس کرتا، جیسے میرے تصورات اور واضح اور صاف ہو جاتے — جو خیالات الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتے تھے وہ اس وقت دماغ پر اس طرح چھا جاتے جیسے دن کے وقت کبھی نہیں چھاتے تھے — پانی کا شاہانہ بہاؤ

نہایت خاموشی کے ساتھ چلتا رہتا۔ پانی کی سیاہ چادر پر کوئی اسٹیمر اوپر یا نیچے کی طرف آہستہ آہستہ تیرتا ہوا بہتا جاتا جیسے کوئی آتشیں [illegible] ہو اور اس کے بھاری پہیوں کی دھیمی سرسراہٹ اس کے گزر جانے کے بعد بھی کانوں میں سنائی دیتی ہو۔ یا کھلے ساحل کے کنارے [illegible] روشنی بکھیر رہی ہو اور اس روشنی سے سرخ سرخ کرنیں پھوٹ رہی ہوں اور پانی پر بہتی جا رہی ہوں۔ جب مچھیروں کی مشعل کی روشنی ہوتی تو اس کے متعلق بھی ایسا تصور کیا جا سکتا تھا کہ کوئی خانماں برباد، آوارہ گرد ستارہ آسمان سے ٹوٹ کر گر پڑا ہے اور دریا پر ایک پھول کی طرح بہتا چلا جا رہا ہے ——— پھول جس میں سے شعلوں کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔

ایسے موقعوں پر کشتیوں میں بیٹھی ہوئی میں عجب عجیب تصورات کی شکل اختیار کرتیں اور بعض خود بخود بے مثال حسن کے منظر پر منظر سامنے لاتے جاتے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ گویا میں رات کے خلا میں دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جا رہا ہوں۔

کبھی کبھار اس عالم میں ابروٹ سے ملاقات ہوتی۔ رات کے وقت وہ اور بھی لمبا، اور بھی زیادہ دلکش لگنے لگتا۔

''ارے تم پھر نکل پڑے؟'' وہ پوچھتا اور پھر میرے قریب چپ چاپ بیٹھ کر کسی گہرے طویل خیال میں کھو جاتا۔ اس کی نظریں دریا پر جمی ہوتیں یا آسمان کی طرف اٹھی ہوتیں اور وہ آہستہ آہستہ اپنی سرخی مائل سنہری داڑھی کو سہلاتا جاتا۔ کبھی کبھی وہ اپنی آرزوؤں اور ارمانوں کے خوابوں کو باآواز بلند بھی بیان کرتا:

''میں تھوڑا سا علم حاصل کر لوں پھر تو میں ہر دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ جاؤں گا اور جو کچھ مجھے نظر آئے گا وہ میں سمجھ جاؤں گا۔ دوسروں کو بھی سمجھا دوں گا! اگر انسان اپنے دل کی بات کہہ سکے تو اس سے بڑھ کر کیا بات ہے میرے بھائی۔

یہاں تک کہ عورتیں بھی ––– کچھ عورتیں بھی ––– سمجھ جاتی ہیں اگر ان سے خلوص دل کے ساتھ بات کی جائے – ابھی اسی دن میری کشتی میں ایک عورت سے میری ملاقات ہوئی اور وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ مرنے کے بعد ہمارا کیا حشر ہوتا ہے – ''میں نہ تو جہنم کو مانتی ہوں، نہ جنت کو ––،، کہنے لگی ''آپ کہتے ہیں، عورتیں بھی، میرے بھائی، عورتیں بھی....''

پھر ذرا رک کر جیسے مناسب الفاظ تلاش کر رہا ہو – ''ہاں، وہ... عورتیں بھی تو آخر زندہ روحیں ہوتی ہیں....''

ایزوت رات کو نکلنے والا جانور تھا – اس کا ذوقِ حسن نہایت سلجھا ہوا اور بڑے دلکش انداز میں اس کے متعلق بات کرتا تھا جیسے کوئی خواب دیکھنے والا بچہ بھولے پن کے ساتھ نرم نرم جملے کہتا جاتا ہو – اسے خدا کے وجود پر عقیدہ تھا اور اگرچہ اس عقیدے کی نوعیت گرجے کی تعلیم کے مطابق نہیں لیکن اس میں خوف کا عنصر شامل نہ تھا – اس کے لئے خدا ایک پیارا بوڑھا حسین بزرگ تھا جو اس کائنات کا عقلمند اور نیک دل مالک تھا – ویسے شر اور برائیوں پر وہ اس لئے فتح حاصل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ''ہم سب انسان اتنے بہت سے ہیں کہ پروردگار کو فرصت ہی نہیں ملتی ہے – لیکن خیر ––– وہ کرے گا انشاءاللہ – ہاں ضرور کرے گا ––– دیکھتے جائیے گا – مگر بس وہ یسوع مسیح کی بات جو ہے تو وہ ذرا میری سمجھ میں نہیں آئی – آخر ان کی کیا ضرورت تھی – آخر خدا تو ہے ہی – ہے کہ نہیں؟ اچھا تو ہمارے لئے بس اتنا کافی ہے – مگر نہیں – اب لوگ ہیں کہ ایک اور آدمی کو بیچ میں لا رہے ہیں – کہتے ہیں کہ یہ خدا کے بیٹے ہیں – اچھا اگر بیٹے ہیں تو پھر بھی کیا ہوا؟ آخر خدا تو ابھی تک مرا نہیں ہے –،،

بہرحال ایزوت زیادہ تر میرے پاس چپ چاپ بیٹھا رہتا اور اپنے خیالات میں کھویا رہتا – کبھی کبھار ٹھنڈی سانس بھر کے کہتا:

"اچھا تو یوں ہے یہ بات..."

"کیا؟"

"کچھ نہیں — وہ میں ذرا اپنے آپ ہی سے بات کر رہا تھا..."

پھر ٹھنڈی سانس بھرتا اور دور بادلوں پر نظر جما کے کہتا:

"کیا ہی خوب چیز ہے یہ — زندگی!"

ظاہر ہے مجھے اس کی اس بات سے اتفاق ہوتا:

"ہاں، زندگی بہت ہی خوب چیز ہے!"

پرچھائیوں سے ڈھکا ہوا پانی مخمل کے تھان کی طرح کھلتا ہوا شان کے ساتھ ہمارے سامنے بہتا رہتا، اس کے اوپر کہکشاں کی پٹی خم کھاتی ہوئی دمکتی رہتی، بڑے سنہری ستارے، چمکتی ہوئی چکوکوں کی طرح آسمان میں جھلملاتے رہتے! دل کو عرفانِ زندگی کے متعلق کیا کیا کچھ محسوس ہوتا، وہ عقل کی سرحدوں سے آگے نکل جاتا جیسے اسے حیات کے سب راز معلوم ہوں اور مدھم مدھم گنگناتا جاتا — دور وادیوں سے پرے سر اٹھاتی ہوئی کرنیں سرخ بادلوں کو چیرتی جاتیں اور بس اب سورج آسمان پر مور کے پروں کی طرح اپنے بازو پھیلانا ہی چاہتا ہے!

ایزوت آہستہ سے بڑبڑاتا "اف، یہ آفتاب! جیسے معجزہ..."

سیب کے درخت کلیوں اور پھولوں سے لد کر گاؤں بھر پر گلابی بادل سے چھا گئے تھے اور ان کی کڑوی مہک ہر جگہ گھستی پھرتی تھی، جس کی وجہ سے کیچڑ اور گوبر کی بو دب گئی تھی — سینکڑوں درخت گلابی پھولوں کا ریشمی، بہار آفریں لباس پہنے، گھروں اور میدانوں کے بیچ بیچ میں، برابر سے، قطار اندر قطار، کھڑے ہوئے تھے — چاندنی راتوں میں جب پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں اس طرح جھکورے لیتیں کہ سرسراہٹ بھی نہ سنائی دیتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ سنہری مائل نیلی لہریں پورے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں

ے رہی ہیں — بلبلوں کا جنون انگیز نغمہ مسلسل سنائی دیتا — سارے دن سنہری مینائیں چہچہاتیں اور دھوپ میں مچان ڈریں اور جگنو کہیں جو نظر نہ آتیں، دنیا پر اپنے ستھرے سنگیت کی موسلادھار بارش کرتی رہتیں —

سہاروں اور جھنڈوں پر لڑکیاں اور نوجوان عورتیں گاتی ہوئی، چڑیوں کی طرح اپنے منہہ کھولے، گملوں میں ادھر سے ادھر آتیں اور جاتیں — آنکھوں سے شرابی مسکراہٹ کی نرمی اور گداز چھلک پڑتی — ایزوب کے چہرے پر بھی ایک نسیلی مسکراہٹ آجاتی، اس کا جسم دبلا ہونے لگتا، آنکھیں تاریک گڑھوں میں دھنسنے جاتیں — چہرے کی لکیریں گہری ہو کر وہ اور بھی زیادہ خوبصورت اور مقدس ہستیوں کی طرح متبرک لگنے لگتا۔ وہ سارے دن سو پڑ کر سوتا لیکن جہاں رات آنی شروع ہوتی کہ کھڑا ہوا، فکر میں ڈوبا ہوا گاؤں میں نکل آتا — کوکوسکن اسے گنوارپن سے مگر بڑی محبت سے چھیڑتا اور وہ جھینپ جھینپ کر جواب دیتا:

”چپ رہ بھائی — کیا کیا جانے؟“

پھر بڑے مست انداز میں کہتا:

”آہ، زندگی کتنی شیریں ہے! اور ذرا سوچو تو کس قدر پیار اور نیکی سے بھرپور ہوسکتی ہے زندگی! لوگ ایک دوسرے کا دل گرمانے کے لئے کیسی اچھی اچھی باتیں دریافت کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں — بعض باتیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ انسان سات بار مرکے بھی پیدا ہو تو اسے بھول نہیں سکتیں — جب قبر سے اٹھے گا تو وہی بات سب سے پہلے یاد آئے گی!“

خوخول بڑی محبت سے کبھی کبھی کہتا ”ذرا ہشیار رہنا! شوہروں کے ہاتھ سے ابھی پٹے نہیں ہو —“

”ہاں —— تو سبب تو ہے پٹنے کا“ ایزوب ایمانداری سے تسلیم کرتا —

غرض ہر رات کو میکوں کی اونچی آواز بھجنوں کے نغموں سے تا دریا کے کنارے سے گونجنی شروع ہوتی، بلبلوں کے نغموں کو چھیڑتی ہوئی، دلوں اور روحوں کو گرماتی ہوئی — اس کے گانے میں حیرت انگیز حسن تھا۔ دراصل گانے کا لحاظ کرکے کسان بھی اس کے بہت سے قصور معاف کر دیا کرتے تھے۔

اب سنیچر کے دن ہماری دوکان پر آنے والے گاؤں کے کسانوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جاتی تھی — ان میں بوڑھا سوسلوف، بارینوف، کروتوف، [illegible] اور میکوں برابر ہوتے تھے — اور اس طرح آدھی رات تک سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی کبھی کوئی شرابی لڑ پڑتا — اور کوئی [illegible] کوستن اکثر یہ حرکت کرتا — وہ پرانا سپاہی تھا، کانا تھا اور بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں غائب تھیں۔ دیکھیں تو چلا آ رہا ہے دوکان کی طرف، لڑاکو مرغے کی طرح اکڑتا، آستینیں چڑھی ہوئی ہیں، مکے ہوا میں زوروں سے لہرا رہے ہیں، پھٹی ہوئی چیختی ہوئی آواز میں چیخ چلا رہا ہے:

"خوخول! مقدونیے! ترکی ایمان والے! ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم گرجا کیوں نہیں جاتے ہو — کیوں بے دین! مفسد، منتی! ہم جاننا چاہتے ہیں کہ تم آخر ہو کس قسم کے آدمی!"

لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں "میکا، ذرا یہ تو بتاؤ یہ دونوں انگلیاں کیوں بندوق سے اڑا دی ہیں؟ اتنا ڈر لگتا تھا ترکوں سے؟"

اس بات پر وہ میدان جنگ میں کود پڑتا ہے لیکن کسان سب مل کر اس کو پکڑ لیتے ہیں اور چیختے دھتکارتے اس کو نالے کے سرے پر سے لڑھکا دیتے ہیں — وہ ڈھلوان پر سے لڑھکتا ہوا چیں چیں کرتا جاتا ہے:

"قتل! قتل! مدد! مدد!"

پھر نالے میں سے نکلتا ہے، سر سے پاؤں تک دھول میں اٹا ہوا اور خوخول سے ایک گلاس واڈکا کے پیسے مانگتا ہے۔

''وہ کیوں؟''

''تماشے دیکھ — کہیں کے دام!'' کسان سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے ہیں —

ایک دن کوئی چھٹی تھی — باورچن نے تندور گرم کیا اور پھر باہر احاطے میں چلی گئی — میں دوکان میں کام کر رہا تھا — یکایک مکان سے زور سے سانس لینے کی سی آواز آئی — پھر ساری دوکان تھرتھرانے لگی — الماریوں سے مٹھائیوں کے ڈبے اور اور سامان لڑھک لڑھک کر زمین پر گرنے لگے — شیشے چھنا چھن کرتے ہوئے نیچے گرے اور ساتھ ہی بہت سی اور چیزیں دھڑا دھڑ کرتی زمین پر آ رہیں — میں دوڑا ہوا باورچی خانے میں پہنچا — باورچی خانے سے دھوئیں کے بادل پیچ کھاتے نکلتے ہوئے تمام کمروں میں بھر رہے تھے اور دھوئیں کے نیچے کوئی چیز پھس پھس کرتی چیخ رہی تھی — خوخول نے میرے کندھے پکڑ کر پیچھے کو کھینچا:

''ٹھہرو...''

باورچن باہر گلیارے میں پھوٹ پھوٹ رو رہی تھی —

''گدھی عورت'' روماس نے کہا اور پھر تیر کی طرح دھوئیں کے بیچ میں گھس کر باورچی خانے میں کچھ کھڑبڑ کرنے لگے — پھر زور سے لعنت بھیجی اور آواز دی:

''مت بھوں بھوں کر! جا کے پانی لا!''

فرش پر لکڑی کے کندے پڑے تھے جن میں سے دھواں نکل رہا تھا — ان کے بیچ بیچ میں اینٹیں اور آگ جلانے کی چھپٹیاں پڑی تھیں جو سلگ رہی تھیں — تندور کا سیاہ منھ خالی تھا — میں دھوئیں میں ٹٹولتا ہوا ادھر بڑھا جدھر پانی رکھا رہتا تھا، ایک بالٹی فرش پر سلگتی آگ پر پھینکی اور پھر لکڑیاں واپس تندور میں جھونکنے لگا —

''سنبھل کے!'' خوخول نے کہا — وہ باورچن کو اس سب گڑبڑ

سے نکال کر باہر لے جا رہے تھے — اس کو کمرے میں دھکیل کر خوخول نے اسے حکم دیا:

”جاؤ، دوکان میں تالا ڈال دو!“ اور مجھے حکم دیا ”میکسیمچ! دھیرے دھیرے! ہو سکتا ہے پھر کوئی دھماکہ ہو...“ پھر وہ اکڑوں بیٹھ گئے اور زمین پر پڑے ہوئے گول کندوں میں سے ہر ایک کا غور سے معائنہ کرنے لگے — پھر وہ تندور کے پاس گئے اور جو لکڑیاں میں نے ابھی بھری تھیں ان کو کھینچ کر باہر نکالنے لگے —

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

”یہ — یہ دیکھو!“

انہوں نے میری طرف جو کندہ بڑھایا وہ کچھ عجیب طریقے سے ٹوٹا ہوا تھا — میں نے زیادہ غور سے دیکھا تو یہ نظر آیا کہ اس کو اندر سے کھوکھلا کیا گیا تھا اور اس کی اندرونی دیواریں کالکھ سے سیاہ ہو رہی تھیں —

”دیکھا تم نے؟ کسی شیطان نے اس چیز کے اندر بارود بھرا ہے — گدھے کہیں کے — بھلا آدھہ سیر بارود سے کوئی کسی کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟“ انہوں نے کندے کو رکھ دیا اور ہاتھ دھوتے کہنے لگے:

”اچھا ہوا کہ جو اکسینیا کمرے کے باہر تھی — ہو سکتا تھا کہ اس کو چوٹ آ جاتی...“

کڑوا دھواں اب اوپر اٹھتا ہوا صاف ہوتا جا رہا تھا اور اب مجھے نظر آیا کہ الماری پر رکھی ہوئی پلیٹیں سب چٹخ گئی تھیں اور کھڑکیوں کے تمام شیشے ختم ہو گئے تھے — تندور کے منہ کے پاس سے بہت سی اینٹیں اڑ گئی تھیں —

خوخول کا اس وقت کا سکون مجھے اچھا نہیں لگا — ان کا رویہ اس وقت ایسا تھا گویا اس احمقانہ چال کا ان پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا — باہر بہت سے بچے اکٹھے ہوکر ادھر ادھر دوڑ رہے تھے اور آوازیں سنائی دے رہی تھیں:

''ہائے ہائے! خوخول کے یہاں آگ لگ گئی!''

ایک عورت پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور شکستہ لہجے میں گھبرا گھبرا کر چیخ رہی تھی:

''میخائل، لوگ دوڑ رہے ہیں جیسے آگ میں دروازہ توڑ دو!''

''ارے چپ! میں آ رہا ہوں''، انہوں نے اپنی بھیگی ہوئی داڑھی خشک کرتے ہوئے کہا۔

شعلے اور زینے سے بکھرے ہوئے روشن دار چھپرے کمرے کی ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے۔ دھوئیں میں ان کی آنکھیں سکڑ کر چمچما رہی تھیں۔ کسی نے زور سے اور تیز اونچی آواز میں پکارا:

''نکال دو ان لوگوں کو دوزخ سے! ان کے جھگڑے کسی طرح نبٹتے ہی نہیں! خدایا!''

سرخ بالوں والا ایک چھوٹے سے قد کا آدمی بار بار اچک کر کھڑکی پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور ہر کوشش سے پہلے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا کر کچھ بڑبڑاتا جو سنائی نہ دیتا۔ لیکن آخر وہ کھڑکی پر نہیں چڑھ سکا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک کلہاڑی تھی اور بائیں سے کھڑکی کا چوکھٹا پکڑنے کی کوشش کرتا تھا جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ جاتا تھا۔

روماس ہاتھ میں وہ کھونٹی لکڑی لئے کھڑکی کے پاس پہنچے اور اس سے پوچھنے لگے:

''کہاں چل دئے؟''

''آگ بجھانے کے لئے...''

''یہاں اب آگ کچھ نہیں لگی ہے...''

اس کسان نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور غائب ہو گیا۔ روماس دوکان کے برامدے میں نکلے اور انہوں نے لکڑی کا کھونٹا ہلا ہلا کر زور سے مجمع سے کہا:

''ہم میں سے کسی نے اس کے بارود سے بھرے ہوئے اسلحہ میں جھانکا تک نہ تھا لیکن ایسا بارود نہیں تھا کہ کوئی آسانی سے سمجھ سکتا۔۔''

جوتوں کے سخت تسمے کھولتے ہوئے میں نے پھر مجمع پر نظر ڈالی — وہ کلہاڑی والا کسان تو جھلایا ہوا اپنے پڑوسیوں سے کہہ رہا تھا:

''افوہ، ایسا اس نے وہ کھیل کھلا کر مجھ پر [illegible] کہ کیا کہوں بس۔۔''

سپاہی گوسن غصے میں چیخ رہا تھا:

''نکال دو اس بے دین کو! عدالت میں لے چلو۔۔۔''

لیکن زیادہ تر لوگ خاموش تھے اور روماس کی ٹکٹکی لگائے دیکھتے ہوئے ان کی باتوں کو مشکوک انداز سے سن رہے تھے — اور روماس کہتے جا رہے تھے:

''کسی گھر کو اڑا دینے کے لئے بہت زیادہ بارود کی ضرورت ہوتی ہے، غضب سولہ سیر کی! خیر، مگر اب لوگ گھر کیوں نہیں جاتے؟''

کسی نے آواز دی:

''مکھیا کہاں ہے؟''

''پولیس جمعدار کو بلاؤ!''

لوگ دھیرے دھیرے، بے دلی سے چھٹنے لگے جیسے انہیں کسی کا افسوس ہو رہا ہو۔

ہم لوگ اندر آ گئے — اکسینیا نے چائے انڈیلی — اس سے پہلے میں نے اکسینیا کو ایسے اچھے اور دوستانہ موڈ میں کبھی نہیں دیکھا تھا — ہمدردی کی نظروں سے روماس کی طرف دیکھ کر بولی:

''آپ کبھی تھانے میں شکایت تو کرتے نہیں ہیں اس لئے ان لوگوں کا جو جی چاہتا ہے وہ حرکتیں کرتے رہتے ہیں —''

''کیا آپ کو کسی بات پر بالکل غصہ نہیں آتا،، میں نے پوچھا۔

''مجھے اس کی فرصت نہیں ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں پر غصہ کیا کروں۔،،

میں سوچنے لگا کہ کاش ہر شخص اپنے ہوش اتنے برے وقت اسی طرح اوسان قائم رکھ سکتا! اور اسی وقت انہوں نے یہ بھی پوچھنا شروع کر دیا کہ قازان سے میرے لئے کون کون سی کتابیں لائیں — وہ کچھ ہی دن بعد قازان جانے والے تھے۔

بعض اوقات مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ روح کی جگہ اس آدمی کے وجود میں کوئی مشین لگی ہوئی تھی جس میں کوک بھر دی گئی تھی اور اس کی زندگی ایک یکساں چال سے چلتی چلی جا رہی تھی — مجھے خوخول سے بس پیار تھا، ان کی عزت بھی کرتا تھا لیکن کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ کسی دن ان کو غصہ بھی آئے، وہ چیخیں، پیر پٹخیں، چاہے مجھ پر غصہ کریں چاہے کسی اور پر — لیکن شاید یہ بھی ہوتا تھا کہ یا تو ان کو غصہ آ ہی نہیں سکتا تھا یا وہ غصے کو آنے ہی نہیں دیتے تھے — جب ان کو حماقت یا کمینے پن پر کوفت ہوتی تھی تو صرف ان کی بھوری آنکھیں طنزیہ انداز میں سکڑ جاتی تھیں اور کوئی بڑا ہی سرد جملہ ان کے منھ سے نکلتا تھا جس میں بالکل رعایت یا مروت نہیں ہوتی تھی — ایک بار انہوں نے سوسلوف سے پوچھا:

''یہ تم مکاری کیوں کرتے پھرتے ہو؟ تمہارا ایسا بوڑھا آدمی اور ایسی مکاری؟،،

بوڑھے کسان کے جھنجھرے ہوئے گالوں اور ماتھے پر آہستہ آہستہ سرخی آ گئی۔ یہاں تک کہ اس کی برف سی سفید داڑھی بھی جڑوں پر سے گلابی ہوتی نظر آنے لگی۔

''آخر اس سے تمہیں فائدہ ہی کیا ہوتا ہے؟ خوامخواہ کو تم لوگوں کی نظروں میں اپنی عزت کھوتے ہو۔،،

سوسلوف نے سر جھکا لیا:

"ہاں ٹھیک تو ہے، فائدہ تو اس سے کچھ بھی نہیں ہے۔"

بعد کو اس نے ایزوت سے کہا:

"یہ ہے روحانی پیر! بس اسی طرح کے ہمارے افسر ہوئے..."

تھوڑے مختصر میں اور صفائی کے ساتھ روماس نے سمجھایا کہ ان کی غیرحاضری میں مجھے معاملات کو کس طرح چلانا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ صبح کے دھماکے کے واقعے کو اور ان کو جو مار ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی اس کو اس طرح بھول چکے ہیں جیسے کوئی مکھی کے ڈنک کو بھول جاتا ہے۔

بانکوف اندر آیا، تندور کی طرف دیکھا اور اداس منہ بنا کر پوچھا:

"ڈر لگ رہا ہے؟"

"کس سے؟"

"یہ تو جنگ ہے!"

"آؤ آؤ، چائے پیو ہمارے ساتھ۔"

"میری بیوی میرا رستہ دیکھ رہی ہوگی۔"

"کہاں رہے؟"

"مچھلی پکڑنے گیا تھا ایزوت کے ساتھ۔"

وہ روانہ ہو گیا۔ باورچی خانے کے پاس سے گذرتے وقت وہ سوچتا ہوا بڑبڑاتا ہوا کہتا جا رہا تھا:

"یہ تو جنگ ہے!"

بانکوف خوخول کے سامنے بہت کم بات کرتا تھا جیسے اہم اور پیچیدہ باتیں دونوں کے درمیان بہت پہلے طے ہو چکی ہوں۔ جب روماس نے ایوان خوفناک کی حکومت کی داستان سنائی تھی تو مجھے یاد ہے کہ ایزوت نے کہا تھا:

"توبہ کیا ہی ہلا دینے والا زار تھا!"

"قصائی تھا، قصائی" کوکوشکن نے ٹکڑا لگایا اور بانکوف بڑے یقین کے لہجے میں بولا:

اس نے کچھ زیادہ عقل مندی کی نہیں [illegible] کو بڑے بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو مار ڈالا ہو کب مانتے جبکہ ان کی جگہ اس نے چھوٹے چھوٹے زمینداروں اور مال لوگوں کا ایک جم غفیر پیدا کر دیا — اور پھر ادھر سے [illegible] کو بھی ہو لا کر بھر دیا — چھوٹے زمیندار بڑے زمینداروں سے بدتر ہوتے ہیں — لیکن کوئی بھیڑ کوٹے نہیں نہ آپ ان سے [illegible] مار دیں لیکن وہ [illegible] چھوڑنے سے زیادہ کر سکتی ہے —،،

گو نو مکن حکمی سی سر کی ایک ہلکی سی آہ — [illegible] کے سینہ پر اور اس [illegible] انھیں پھر سے جھٹکے ہوئے بولا:

''یہ بڈھے لوگ [illegible] کیا سوچتے ہیں — ایسے سروں کی کو چوٹیں نہیں ماری جاتیں [illegible] سمجھتی ہے اور [illegible] اور کی جان لینے کا سوال ہوگا تو ایسی جونی کا زور لگا دیں گے — میں جانتی، آپ زیادہ سامان جمع نہ کیجئے گا — بہتر ہے کہ [illegible] جانے اور ایک دفعہ میں زیادہ سامان نہ لائیے — آپ کو پتہ بھی نہ چلے گا اور یہ لوگ آگ لگا دیں گے — اب مصیبت کا آنا یقینی ہے کیونکہ آپ نے وہ [illegible] جو ٹھیک سے جمانی شروع کر دی ہے —،،

''وہ چہرہ،—— جو گاؤں کے امیروں کی نمائندگی کر رہی تھی، وہ [illegible] کی انجمن تھی — اس وقت تک [illegible]، [illegible] اور دوسں اور [illegible] کسانوں کے ساتھ مل کر خوخول نے [illegible] کی [illegible] مکمل کر لی تھی — زیادہ تر گھرانے اب [illegible] کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے۔ دولان میں [illegible] کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ نکمے [illegible] اور میکوں بھی خوخوں کی مدد کے لئے ہر طرح دوڑے پڑے تھے

مجھے میکوں سے خاص دلچسپی تھی — اس کے غمگین اور حسین گیت سیدھے میرے دل میں اتر جاتے تھے — میکوں گاتے وقت آنکھیں بند کر لیتا تھا اور اس کے دکھی چہرے کی [illegible] رک جاتی تھی —

اندھیری راتوں میں اس میں مخصوص زندگی عود کر آتی تھی جب چاند نہیں نکلتا تھا، آسمان پر ٹھہرے ہوئے بادلوں کی تہہ بڑی موٹی ہوتی — تبھی کبھی ایسے میں وہ چپکے سے مجھ سے کہتا:

"آؤ، وانگا پر چلیں —"

میں وانگا پر پہنچتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ سیکوں اسرلٹ مچھلی پکڑنے کی تیاری کر رہا ہے اور چوری چوری اپنے کانٹے، انکسی وغیرہ ٹھیک ٹھاک کر رہا ہے — وہ اپنی کشتی کے کنارے پر بیٹھا ہوا پاؤں ندی کے تاریک پانی میں لٹکائے ہلا رہا ہے اور مجھ سے آہستہ سے کہتا ہے:

"جب شریف لوگ مجھ سے برا برتاؤ کرتے ہیں تو میرا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے — میں اس بات کو برداشت کر سکتا ہوں — آخر ان کا لحیہ تو ہوتا ہی ہے — بہت سی ایسی باتیں جانتے ہیں جو میری سمجھ میں کبھی آ ہی نہیں سکتیں! مگر جب میرے ایسے انسان بھی مجھ کو پھٹکارنے لگیں — یعنی بالکل میرے ہی ایسے، تو بھلا بتاؤ کہ کیسے سہا جائے! آخر ہم لوگوں میں فرق ہی کیا ہے سوا اس کے کہ وہ اپنی دولت روبلوں میں گنتے ہیں، میں پیسوں میں گنتا ہوں — بس یہی نا —"

اور سیکوں کا چہرہ شکایت کے احساس سے تمتما رہا ہے، چہرہ کانپ رہا ہے، انگلیاں پھرتی سے کام کر رہی ہیں — کانٹوں کو ریتی سے تیز کر رہا ہے اور لنگر میں انکسیاں اپنی اپنی جگہ سہہ رہا ہے — اس کی خوبصورت آواز نرمی سے بہتی چلی جا رہی ہے:

"لوگ مجھے چور کہتے ہیں — ٹھیک ہے، میں چوری کرتا ہوں — اچھا — لیکن کیا ہر شخص ڈاکہ ہی پر نہیں زندہ رہتا؟ ہر شخص جو بھی بڑا ہے وہ دوسرے سے چھین لینے کی کوشش کرتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح زندگی چلتی ہے — خدا تو ہم لوگوں سے کوئی محبت کرتا نہیں، شیطان کی ہی مرضی چلتی ہے —"

ہر ایک مرد عورت کے ساتھ ساتھ بیٹھا ہے۔ اِدھر اُدھر سے [illegible] [illegible]، [illegible] جیسے رہتی تھیں۔ اسے پتہ ہے کہ دوسرا [illegible] بھی نہیں [illegible] نہیں [illegible] کی زبان سے اس [illegible]، [illegible] کے ساتھ [illegible] جس [illegible] وہ بار بار میرے [illegible] کو ڈھونڈتی [illegible] [illegible] اپنے ساتھ [illegible] [illegible] [illegible] کسی کے [illegible] [illegible] کی ٹھوکروں میں —

''آخر انسان کو زندہ تو رہنا ہی ہے کسی نہ کسی طرح یا نہیں؟'' میکون پوچھتا ہے اور پھر ٹھنڈی سانس بھرتا ہے —

اوپر سے ایک بچے کے زور سے رونے کی آواز آتی ہے — مجھے یوں جیسے موت کی دستک دے رہی ہے — اپنے دل سے سوال کرتا ہوں: ''لیکن کیوں زندہ رہتے [illegible] کی طرح، جیسے ہم جیسے ہوں،، قریب ہو رہا ہے، [illegible] یہ اندھیرے کی کوئی انتہا نظر نہیں آتی —

میکون بڑبڑاتا ہے ''یہ لوگ حیوانوں کو مار ڈالیں گے اور ہمیں بھی ...'' پھر اچانک وہ بہت مدھم آواز میں گانے لگتا ہے:

میری اماں نے
پیار سے مجھ سے کہا،
ماں نے کہا مجھ سے
بنسری بجاؤ چین کی...

اس کے ہونٹ جھکنے لگے ہیں، آواز میں محرومی، غمگینی اور دردناکی بڑھنے لگتی ہے، دھنوں کو ٹھیک کرتی ہوئی انگلیوں کی رفتار آہستہ ہونے لگتی ہے —

پر میں نے تو چین
کی بنسری بجائی نہیں،
آہ بجائی نہیں، ہاں بجائی نہیں،
چین کی بنسری بجائی نہیں...

مجھ پر ایک عجیب تاثر طاری تھا جیسے اس عظیم الشان تاریک چادرِ آب کے بوجھ کے نیچے دنیا دم واپسیں لے رہی ہے، جیسے میں سطح دنیا سے بھٹکا ہوا اس اندھیرے میں دوڑتا چلا جا رہا ہوں جہاں سورج ہمیشہ کے لئے غرق ہو گیا ہے

سکون جس طرح جھٹکنا شروع کرتا ہے اسی طرح اس کو جھٹک ختم بھی کر دیتا ہے، خاموشی سے کسی کو کنارے پر سے اندر پانی میں کھینچتا ہے، اس میں جذب ہے اور بغیر کسی آہٹ کے تاریکی میں غائب ہو جاتا ہے — میں اس کو جاتے ہوئے کھڑا رہ جاتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ ایسے لوگ کیوں زندہ رہتے ہیں —

میرا دوسرا دوست کرسوف تھا — ٹھگ، سیٹی باز اور کاہل، آوارہ گرد اور گپ باز — وہ ماسکو میں رہ چکا تھا اور اس شہر کا ذکر بڑی نفرت کے ساتھ کرتا تھا:

''شیطان کا خاص ذاتی شہر ہے وہ — اس قدر گندا ہے کہ توبہ — گرجے؟ چودہ ہزار اور چھ عدد — اور لوگ — ہر ایک جواری اور گندہ — اور سب کو خارش ہوئی ہے، خارش زدہ گھوڑوں کی طرح — اب مانو چاہے نہ مانو ہوتی تو ہے — کیا سوداگر، کیا سپاہی، سارے ہی شہری کھجلاتے پھرتے ہیں — مگر ہاں ایک بات ہے کہ وہاں بہت بڑی توپ ہے — سب سے بڑی توپ ہے وہ — اسے پیٹر اعظم نے خود ڈھالا تھا، باغیوں کو اڑانے کے واسطے — دراصل ایک عورت تھی، اس نے محبت کے سلسلے میں پیٹر کے خلاف بغاوت کروا دی تھی — پیٹر اس کے ساتھ سات سال رہا، ایک ایک دن کر کے سات سال — اور پھر اس کو تین بچوں سمیت چھوڑ دیا تو اس نے غصے کے جوش میں بغاوت کی اور غدر کھڑا کر دیا — تو پھر کیا ہوا بھائی کہ پیٹر نے باغیوں کے خلاف ایک بار وہ توپ چھوڑ دی بس — نو ہزار تین سو اور آٹھ جانیں ختم ہو گئیں! خود زار بھی بوکھلا

اور بوڑھے پادری فلارت سے بولا "ہم لوگوں کو اس بوت کا منہہ شہر سے باہر کر دینا چاہئے — یہ شیطان کا کھلونا ہے اور خواہ مخواہ کا تماشا ہے"۔ — چنانچہ بوت بند کرکے شہر لگا دی گئی....

جب میں نے اس سے کہا کہ یہ سب بکواس ہے تو برا مان کر بولا:

"اے پروردگار! تم عجیب طرح کے آدمی معلوم ہوتے ہو! میں نے یہ سب باتیں ایک بہت ہی زیادہ پڑھے لکھے آدمی سے سنی ہیں اور تم کہتے ہو کہ....

وہ کیف بھی گیا تھا "مقدس ہستیوں کی زیارت کرنے"۔ — اس تجربے کے متعلق اس نے بیان کیا:

"وہ شہر بس ایسا سمجھو جیسے اپنا یہ کوؤں ہے۔ بالکل ہماری طرح ہی اونچائی پر آباد ہے۔ دریا بھی ہے مگر اب یہ مجھے یاد نہیں کہ اس دریا کا نام کیا تھا — مگر ویسے وہ دریا کچھ ہے نہیں — ہمارے وولگا کے مقابلے میں تو چہلا ہے سمجھو — اتنا میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ عجیب گڑبڑجھالہ شہر ہے، تمام گلیاں ٹیڑھی میڑھی اور سب اونچائی کی طرف چڑھتی ہوئی — لوگ سب خوخول ہیں لیکن اپنے میخائل رومانس کی طرح کے خوخول نہیں ہیں وہ... وہ اور ہی قوم ہے — کچھ تاتاری اور کچھ پولش خون ملا ہوا — بات کرتے ہیں تو لگتا ہے بڑبڑبڑبڑ کر رہے ہیں — بہت گندے رہتے ہیں اور کبھی کنگھی نہیں کرتے — مینڈک کھاتے ہیں وہ لوگ اور وہاں مینڈکوں کا وزن پانچ پانچ سیر ہوتا ہے — گاڑیوں میں اور ہل جوتنے اور کسانی کرنے میں بیلوں سے کام لیتے ہیں — بیل البتہ وہاں کے بڑے شاندار ہوتے ہیں، ان میں سے جو چھوٹے سے چھوٹا ہوگا وہ بھی ہمارے یہاں کے بیل سے چار پانچ گنا بڑا ضرور ہوگا — اسی پنسیری تو اس کا وزن ہوتا ہے — اور اس شہر میں ستاون ہزار راہب اور دو سو ستر بڑے پادری ہیں... ارے!

• تو عجیب آدمی ہو! اس بات پر بحث کرنے کا [illegible] ہی [illegible] نہیں [illegible] کو [illegible] جو میرے بھائی، بس ہمیشہ کی بات [illegible] مشکل معاملہ ہے!''

اور [illegible] سے خاص دلچسپی تھی [illegible] مچھلی [illegible] اور [illegible] دنیا [illegible] لیکن اس [illegible] نہیں [illegible] غصہ [illegible] سکتا [illegible] وقت میں ایک عجیب سی [illegible] سے [illegible] ہونے [illegible] شور [illegible] اپنے اعتماد کو [illegible] غصہ [illegible] ذرا [illegible] جواب نکل [illegible] وہ زمین پر [illegible] ہوئے اعتماد کی نظر [illegible] اور [illegible] کی سی معصوم حیرانی سے ایک‌دم کہتا:

''[illegible] یہ بھی [illegible] چیز ہے [illegible] زمین سے اس کو [illegible] نہیں جا سکتا!''

[illegible] کی حالت [illegible] رہتی تھی [illegible] سے بے‌ڈول، بے [illegible] اجاڑ صورت [illegible] لیکن اس کا چہرہ تقریباً خوبصورت [illegible] اس کی داڑھی [illegible] اور [illegible] تھی اور اس کی نیلی آنکھوں میں [illegible] مسکراہٹ کوندتی رہتی تھی۔ اس کی اور [illegible] کی طبیعتیں [illegible] ملتی جلتی ہوئی تھیں اور [illegible] اسی مناسبت کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے سے [illegible] رہتے تھے۔

[illegible] کو [illegible] سمندر میں مچھلی پکڑنے کا [illegible] تھا اور اس کے متعلق بےحد اترایا کرتا تھا:

''[illegible] بھائی، سمندر کے برابر کوئی چیز ہے ہی [illegible] میں! آدمی [illegible] کے آگے [illegible] سکتا ہے — [illegible] اس [illegible] تو بس پھر اسی [illegible] بھی نہیں رہتی۔ اور زندگی بھی وہاں بڑی [illegible] سمندر کے کنارے [illegible] ہوئے ہیں یہاں تک کہ ایک بڑا [illegible] بھی تھا اور کوئی [illegible] بھی نہیں تھا۔ ہماری تمہاری طرح [illegible]

[illegible] بھی بھی ۔۔ میں رہتی ہوں۔ [illegible] ہمیشہ [illegible] سے رہتا۔ بھلا کسی کو [illegible] جاتے؟ لیکن وہ [illegible] کے [illegible] نہ سکی سے نہیں ہے ’’میرے [illegible] ہی خدا حافظ۔۔ [illegible] کہ [illegible] اور دوسری [illegible] میں [illegible] پھیلاؤ ہوتا ہے جتنا آسمان میں۔ [illegible] میں بھی ہمیشہ [illegible] جاؤں۔ مجھے [illegible] ایک تکیہ نہیں [illegible] میں! مجھے [illegible] ریگستان میں رہنا چاہتے ہیں مگر بس [illegible] نہ میں بھی نہیں [illegible] کہ اچھے ریگستان [illegible] ہوتے ہیں۔۔

وہ [illegible] میں اس طرح [illegible] جیسے [illegible] گیا۔۔ [illegible] اپنے [illegible] کی [illegible] کی [illegible] سے [illegible] سے [illegible] کے [illegible]

’’کس قدر [illegible] سے [illegible] ہے۔ [illegible] ہے، بہت دلچسپ!‘‘

یہاں تک کہ [illegible] جیسے [illegible] والا [illegible] کی [illegible] ایک دن [illegible] سے کہنے لگا:

’’دیکھیے، [illegible] کا یہ دعویٰ ہے کہ [illegible] میں جو کچھ ایوانِ خوفناک کے متعلق لکھا ہے وہی سب [illegible] نہیں ہے کیونکہ [illegible] میں ایوانِ خوفناک کی بہت سی باتوں پر [illegible] ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے ۔۔ دراصل وہ ہمیشہ انسان نہیں رہتا تھا ۔۔ [illegible] تنہا ہے وہ کبھی [illegible] جاتا تھا ۔۔ اسی کے [illegible] احترام میں ہمارے [illegible] پر یہ [illegible] کی [illegible] رہتا ہے۔۔

[illegible] ہزاروں بار مجھے یہ نظر آیا [illegible] اور غیرمحسوس [illegible] سے [illegible] سے [illegible]۔

دلچسپی لیتے ہیں اور زندگی کی صحیح اور سچی باتوں کی تشریح اور توضیح سے گھبراتے ہیں۔ جب میں نے یہ بات خوخول سے کہی تو وہ مسکرائے:

”یہ بحث ختم ہو جانی چاہئے۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگ سوچنا شروع کر دیتے ہیں! پھر وہ خود ہی اسی فکر کے واسطے حقیقت تک پہونچ جاتے ہیں۔ ورنہ خود اپنی ایجادیں کرتے اور من گھڑت کہتے ہیں۔ یہ پارسنوف اور [illegible] سمجھنا چاہئے نہ ان کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ لوگ فنکار ہیں، تخلیق کرنے والے۔ حضرت عیسیٰ بھی اسی طرح کے تخلیقی فنکار تھے اور یہ تو سمجھنا ہی پڑے گا کہ حضرت عیسیٰ کی بعض بعض حقیقتیں بڑی سچی نہیں ہیں۔،،

ایک اور بات جس پر مجھے تعجب ہوتا تھا وہ یہ کہ یہ سب لوگ خدا کا ذکر بہت ہی کم اور بہت بے دلی سے کرتے تھے۔ صرف بڈھا موصوف اکثر بڑے پختہ عقیدے کے ساتھ کہتا:

”یہ سب پروردگار کی مرضی ہے!،،

اور مجھے ان الفاظ میں ہمیشہ مایوسی کی گہری جھلک نظر آتی تھی۔ میں ان لوگوں کے ساتھ بہت خوش تھا اور شاموں کو جو بات چیت ہوا کرتی اس سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ روسی جو بھی مسئلہ اٹھاتے وہ مجھے ایسا لگتا کہ ایک عظیم‌الشان درخت کی جڑوں کی طرح، اس کی جڑیں زندگی کے تودے میں اندر تک دھنسی ہوئی ہیں، زندگی کے بالکل دل میں پیوستہ ہو کر اور بہت سے عظیم‌الشان درختوں کی جڑوں سے گتھی ہوئی ہیں اور ان درختوں کی ہر شاخ حسین خیالات کی کلیوں سے لدی ہوئی ہے، موثر الفاظ کے پتوں سے بھرا ہے۔ کتابوں کے آب حیات سے سیراب ہوتے ہوئے مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں بھی نفساً ترقی کر رہا ہوں۔ اب میں زیادہ اعتماد کے ساتھ بات کرتا تھا اور کئی مرتبہ خوخول نے کھل کے ہنس کر مجھ سے کہا:

''سیلسیمچ، یہ خوب جرح کر رہے ہو''

میں ان چند لمحوں کے لیے ان کا کس قدر مشکور ہوا تھا!

پانکوف کبھی کبھی اپنی بیوی کو بھی ساتھ لاتا تھا — نرم صورت، شہر کے سے کپڑے پہنے ہوئے، نیلی آنکھیں جو دھوپ سے چمکتی رہتیں، وہ کمرے کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی رہتی، بڑی خاکساری سے ہونٹ بھینچے لیکن ذرا دیر بعد اس کے لب کھل جاتے، آنکھیں پھٹ جاتیں اور معصوم حیرانی اس پر چھا جاتی — پھر کسی تیز جملے پر وہ یکایک ہنسنے لگتی اور گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیتی — پانکوف آنکھ مار کر روماس سے کہتا:

''یہ سمجھتی ہے!''

خوخول سے ملنے ایسے بہت سے لوگ آیا کرتے تھے جو بہت محتاط رہتے تھے — روماس ان کو کوٹھے پر میرے والے کمرے میں لے جاتے اور وہ گھنٹوں وہاں رہتے — اکسینیا ان کا کھانا پینا وہیں پہنچا دیتی اور وہ اسی جگہ سوتے — صرف مجھ کو اور اکسینیا کو ان لوگوں کی موجودگی کا علم ہوتا — اور اکسینیا تو روماس سے اتنی عقیدت رکھتی تھی کہ ان کی پرستش کرتی تھی — پھر رات کے وقت ایزوت اور پانکوف ان لوگوں کو کشتی میں لے کر کسی گذرتے ہوئے اسٹیمر پر پہنچا دیتے یا لوبیسکی کے گھاٹ پر اتار آتے — میں اونچے کنارے پر کھڑا دیکھتا رہتا کہ کبھی تاریک اور کبھی سیمیں چاندنی سے منور دریا پر وہ کشتی ایک داغ کی شکل میں بہتی ہوئی پار جا رہی ہے — اس پر لالٹین برابر لہرائی جا رہی ہے تاکہ کسی گذرتے ہوئے اسٹیمر کے کپتان کی نظر اس پر پڑ جائے — اور یہ نظارہ دیکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا کہ میں کسی عظیم الشان اور پراسرار کام میں حصہ لے رہا ہوں —

ماریا دیرنکووا شہر سے آئی لیکن اب مجھے اس کی نظروں میں وہ بات نہیں نظر آتی تھی جس سے میں پریشان ہو جایا کرتا تھا —

سے تو مجھے اس کی آنکھیں صرف ایک ایسی لڑکی کی آنکھیں معلوم ہوتی تھیں جو اپنے حسن کے احساس پر خوش اور اپنے بھاری بھر کم داڑھی والے دوست کی توجہ پر نازاں ہے — روماس اس سے اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں گفتگو کرتے جس میں طنز کی چاشنی ہوتی لیکن اس کی موجودگی میں داڑھی پر شانیہ زندہ ہوتے اور ان کی آنکھوں میں گرمجوشی کی ایک روشنی سی آ جاتی — ماریا کی نازک آواز سے مسرت پھوٹی پڑتی تھی۔ اس کے زلف کالے ہوتے تھے، سنہرے کانوں میں جھمکے لٹکے رہتے۔ [illegible] اس کے سیاہ نیلے بھنووں کے سے شبیہہ کچھ اس طرح بےقرار رہتے تھے جیسے کسی چیز کی تلاش میں ہوں کہ اس پر جھپٹ پڑیں — وہ آپ ہی آپ کوئی لے گنگناتی رہتی اور اپنے گلابی ننھے سے چہرے کو ایک ننھے سے رومال سے جھلتی رہتی اس میں کچھ ایسی بات تھی جو مجھ میں ایک نئی قسم کی گھبراہٹ پیدا کرتی تھی — میں جیسے اس کا دشمن ہو جاتا تھا اور میرا موڈ بے حد خراب ہو جاتا تھا — چنانچہ میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ اس کا کم ازکم سامنا کروں —

وسط جولائی میں ایزوت یکایک غائب ہو گیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ غالباً وہ ڈوب گیا اور دو دن بعد اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی کیونکہ اس کی کشتی ملی: ایک طرف سے بالکل ٹوٹی پھوٹی، چکنا چور اور بیچ میں ایک بڑا سا چھید — وہ دریا کے اتار پر کوئی پانچ میل دور کنارے پر چڑھ گئی تھی۔ سب ہی لوگ یہ قیاس کر رہے تھے کہ ایزوت سو گیا ہوگا اور اس کی کشتی جا کر بجروں کے جھنڈ سے ٹکرا گئی ہوگی جو دریا کے نچلے بہاؤ پر گاؤں سے تقریباً تین میل دور لنگر کئے ہوئے تھے —

جب یہ واقعہ ہوا تو روماس قزان میں تھے — شام کے وقت کوکشکن دوکان پر آیا۔ اداس، پژمردگی کے عالم میں وہ بوریوں کے ایک ڈھیر پر لیٹ پڑا — کچھ دیر خاموش فرش کو تکتا رہا اور آخرکار پوچھا:

"خوخول کب واپس آ رہے ہیں؟"

"مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔"

اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور سوجے ہوئے ہونٹوں کو سہلاتے ہوئے آہستہ آہستہ مگر گندی گندی گالیاں بکنے لگا۔ بس چر چر کے جیسے کسی کے گلے میں ہڈی پھنس گئی ہو۔

"کیا ہوا؟ بات کیا ہے؟"

اس نے میری طرف دیکھا اور اپنے ہونٹ دانتوں میں دبا لئے۔ اس کی ٹھوڑی کانپ رہی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ ایک لفظ منہ سے نہیں نکلتا تھا۔ میں سوالیہ [illegible] میں منتظر تھا کہ کچھ کہے کیونکہ یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی بری خبر لایا ہے۔ آخرکار اس نے دروازے کی طرف جلدی سے ایک نظر ڈال کر ہکلاتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا:

"میں اور میکون وہاں بستی میں گئے تھے۔ ہم دونوں نے ایزوت کی لاش کو اچھی طرح دیکھا۔ اس کے سینے میں جو زخم ہے وہ کلہاڑی سے لگایا گیا ہے، کلہاڑی سے! ایزوت اپنی موت سے نہیں مرا۔ اس کی جان لی گئی، اس کو قتل کیا گیا ہے۔ یقیناً......"

پیچھے کو سر جھٹک کر وہ پھر گندی گندی گالیاں بکنے لگا۔ وہ سچ مچ میں خشک ہچکیاں لے رہا تھا۔ پھر چپ ہو گیا اور [illegible] پر مصیبت کا نشان تھا۔ یہ منظر اتنا دردناک تھا کہ برداشت سے باہر تھا۔ اس کا پورا جسم ہچکولے کھا رہا تھا، کانپ رہا تھا جیسے غم و اندوہ سے اور غصے سے اس کا دم گھٹا جا رہا ہو۔ وہ رونا چاہتا تھا لیکن رو نہیں پا رہا تھا۔ ایک بار اس نے پھر سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیا، اچھل کر کھڑا ہوا اور روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن شام کو کچھ لوگ دریا پر کہہ رہے تھے کہ انہیں ایزوت کی لاش ملی۔ ایک [illegible] سے [illegible] ہی سطح پر چڑھ آیا تھا، آدھا کنارے پر تھا اور آدھا پانی میں

ڈوبا ہوا تھا، اور اس کے پچھلے حصے کے نیچے [illegible] کا لمبا جسم پھنسا ہوا تھا — وہ اوندھے منہ پڑا ہوا تھا — اس کی کھوپڑی کچلی ہوئی تھی اور مغز پانی میں بہہ چکا تھا — مچھیرے نے پیچھے سے وار کیا گیا تھا — اس کی گدی کو کلہاڑی سے اڑا دیا گیا تھا — لہریں باربار اس کے جسم کو ہلا رہی تھیں، ٹانگوں کو کنارے کی طرف دھکیلتی اور ہاتھوں کو جھلا رہی تھیں، جس سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پانی سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہو —

تقریباً بیس کسانوں کا ایک گروہ منہ لٹکائے، فکرمند چہرے لئے دریا کے قریب جمع ہو گیا تھا — یہ خوشحال کسان تھے — غریب کسان ابھی کھیتوں سے لوٹے نہیں تھے — گاؤں کا مکھیا جو نہایت چالاک اور بزدل تھا، ڈنڈا گھماتا، ادھر سے ادھر گڑبڑ کرتا پھر رہا تھا — باربار سونگھ کے وہ اپنی گلابی قمیص پر ناک پونچھتا جا رہا تھا — موٹا بھاری دوکاندار کوزمین اپنی ٹانگیں پھیلائے، آگے کو توند نکالے، باری باری سے مچھیرے اور لوکونکا کو گھور رہا تھا — اس کی بھوئیں سکڑی ہوئی تھیں لیکن آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور ماتا کے داغ بھرا ہوا چہرہ کمزور اور حیران لگتا تھا —

مکھیا اپنی ٹیڑھی ٹانگوں سے ساحل پر ادھر ادھر سڑاسڑ گھوم رہا تھا اور دوہرا رہا تھا "توبہ، بڑی بری بات ہے! اوہ، کس قدر بدمعاشی کی بات ہے!"

اس کی موٹی تازی گدبدی بہو دریا کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھی پانی کو ایسا گھورے جا رہی تھی جیسے اس کی آنکھیں بے نور ہو گئی ہوں اور کانپتی انگلیوں سے سینے پر صلیب کا نشان بنائے جا رہی تھی — اس کا ذقن کانپ رہا تھا اور نیچے کا موٹا سرخ ہونٹ اس قدر مکروہ طریقے سے لٹک رہا تھا جیسے کسی کتے کے پیلے پیلے بھدے دانت دکھائی دے رہے ہوں — بچے لڑھکتے ہوئے ڈھلوان پر سے چلے آ رہے تھے — لڑکیاں بھی اوپر سے نیچے کی طرف آ رہی تھیں

اور ان کے رنگین لباس ساحل کی جھاڑیوں پر رنگ کے دھبوں کی طرح معلوم ہوتے تھے — پھر اور مرد جمع ہونے شروع ہو گئے — دھول سے اٹے ہوئے کھیتوں سے نکل نکل کر وہ جلدی جلدی آ رہے تھے — مجمع پر ایک دبی ہوئی سی مسلسل بھنبھناہٹ طاری تھی —

"مصیبت تھا یہ آدمی —"

"کون؟ یہ؟"

"یہ کوکوشکن —— ہاں وہ تو ہے ہی مصیبت — ہے ہی —"

"نا حق ایک انسان کا خون کر دیا..."

"ایزوت نے تو کبھی کسی کے ساتھ برائی نہیں کی تھی —"

"کبھی کسی کے ساتھ برائی نہیں کی تھی؟" کوکوشکن غصے میں بھرا ہوا مجمع سے مخاطب ہو کر زور سے چیخا "تو پھر تم لوگوں نے اس کو کیوں مار ڈالا؟ حرامی بچو، حرامی پلو، کیوں مار ڈالا؟"

یکایک ایک عورت زور سے قہقہہ مار کے ہنسنے لگی جیسے اس پر جنون طاری ہو اور اس کی وحشیانہ چیخیں گویا مجمع کے لئے ایک تازیانہ تھیں —— کسان ایک دوسرے پر پل پڑے، چیختے، کوستے، گرجتے — کوکوشکن تیر کی طرح اس موٹے دوکاندار پر جھپٹا اور دن سے اس کے منہہ پر ایک ڈک دیا —

"لے، وحشی درندے!"

پھر مکوں سے راستہ صاف کرتا ہوا وہ تڑبڑ کرتے ہوئے مجمع کو چیر کر باہر نکل آیا اور مجھ سے چیخ کر بولا:

"ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ! لڑائی ہونے والی ہے!"

اس کی آواز مسرت سے بھری ہوئی تھی — اتنے میں کسی نے اس کو ایک گھونسہ دیا — ہونٹ کٹ گیا اور خون بہنے لگا لیکن اس کے چہرے پر اطمینان کی دمک تھی —

"تم نے دیکھا میں نے کوزمین کو کیسا دیا؟"

پھر بارنوف بھی دوڑتا ہوا ہم لوگوں کے پاس آ پہونچا اور بڑ

پھر گردن موڑ موڑ کر مجمع کی طرف دیکھنے لگا جو اب حجرے کے پاس اکٹھا ہو گیا تھا۔ مکھیا کی باریک آواز گونج رہی تھی:

''اچھی بات ہے، تو ثابت کرو نا ـــ میں نے کس کو طرح دی؟ ثابت کرو!''

ہم لوگ کھسکتے ہوئے ہٹنے لگے تو بارسوف آہستہ سے بدبدایا "مجھے تو اس جگہ سے نکل ہی جانا پڑے گا.."

شام بوجھل اور بھیگی تھی - ایسی بوجھل کہ مجھے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی - نیچے لٹکے بادلوں میں ڈوبتا ہوا سورج گہرا سرخ نظر آ رہا تھا اور ہمارے چاروں طرف سہمی ہوئی جھاڑیوں پر سرخ روشنیاں بکھیر رہا تھا - دور کہیں سے بادلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی -

امزوف کی لاش میری نظروں کے سامنے تیر رہی تھی جیسے وہ ندی کی سطح کے ساتھ گہرا گہرا کر بہہ رہا ہو اور لہروں میں اس کی خالی کھوپڑی پر بیٹھے ڈوبتے بال جیسے لہراتے ہو گئے ہوں - کانوں میں اس کی مدھم آواز اس کی بیماری بھری باتیں سنائی دے رہی تھیں:

''ہر انسان میں بچوں کی سی معصومیت کہیں نہ کہیں ضرور چھپی ہوتی ہے اور اسی کو ابھارنا اصل کام ہے۔ انسان کے دل میں چھپے ہوئے نفس معصوم کو! اب مثلاً خوخول ہی کو لو — کوئی دیکھے تو سمجھے لوہے کے بنے ہوئے ہیں وہ لیکن ان کی روح بچوں کی سی ہے!''

کوکوشکن میرے ساتھ چلتا چلتا بھنسی بھنسی آواز میں بولا:

''یہ لوگ ہم سب کا اسی طرح خاتمہ کر دیں گے... اف پروردگار! کیا حماقت ہے یہ!''

اس واقعے کے تین چار دن بعد خوخول گھر پہنچے — جب وہ پہنچے تو رات کافی جا چکی تھی لیکن وہ نہ جانے کس بات پر بڑے خوش تھے اور بڑی محبت سے ملے — جب میں نے دروازہ کھول کر ان کو اندر کیا تو میرا کندھا تھپتھپا کر بولے:

''مسٹر سمیع، معلوم ہوتا ہے [illegible] ابھی نہیں سنی ہو۔''

''ایزوت کو مار ڈالا—''

''کیا... آ... ہ...''

ان کے گالوں پر عضلات کی چھوٹی چھوٹی لرزش ابھر آئی اور داڑھی اس طرح کانپنے لگی جیسے [illegible] — وہ کوئی اشارہ بھی بھول گئے [illegible] کے سامنے [illegible] لمحے تک سر ہلاتے ہوئے ان کی آنکھیں ساکت تھیں

''ہوں — ہو، معلوم کہ لوگوں کے ہاتھوں وہ ختم ہوا۔ ہاں، ہاں — وہ تو ہے ہی...''

وہ آہستہ آہستہ جا کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئے، تھکے ہوئے انداز میں پاؤں پھیلائے —

''میں ہمیشہ اس کو خبردار کرتا رہتا تھا، سمجھاتا رہتا تھا مگر... کیا پولیس وغیرہ بھی آئی تھی؟''

''کل — کوتوال صاحب آئے تھے —''

''اچھا تو اس کا نتیجہ کیا نکلا؟'' پھر اپنے سوال کا خود ہی جواب جوڑ دیا ''ہونا کیا ہے؟ کچھ نہیں۔''

میں نے انہیں بتایا کہ کوتوال صاحب حسب دستور گورنمنٹ کے یہاں مقیم ہوئے ہیں اور انہوں نے دوکاندار کو مارنے کی سزا میں کو لونکو کو حوالات میں بند کر دیا تھا —

''ہوں — تو یہ بات ہے اب بھلا کوئی کیا کہے —''

میں سماوار گرم کرنے باورچی خانے میں چلا گیا —

چائے پیتے ہوئے روماس نے کہا:

''کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہ لوگ اپنے بہترین لوگوں کو اس طرح مار ڈالتے ہیں — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جتنا ہی زیادہ کوئی انسان شریف ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ یہ اس سے ڈرتے ہیں — جیسے وہ ان کے رستے کا روڑا ہو —— بے مصرف، بے کار — جب مجھے گھسیٹ کر

سائبیریا لے جایا جا رہا تھا تو میری ملاقات ایک سزایافتہ مجرم سے ہوئی تھی — اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ چوتھا تھا — دراصل پانچ آدمیوں کا ایک گروہ مل کر چوری کرتا تھا اور یہ بھی ان ہی میں تھا — اچھا تو پھر ایک دن ان پانچ میں سے ایک نے تجویز کی کہ ہم لوگ اس کام کو چھوڑ دیں — آخر اس سے فائدہ بھی کیا ہے، کچھ امیر تو ہم ہو نہیں گئے اب تک — اور اس تجویز کی بنا پر ان لوگوں نے اس کا گلا گھونٹ ڈالا جب وہ نشے میں سو رہا تھا — جس ساتھی کو ان لوگوں نے مارا اس کی اس قدر تعریف یہ مجرم مجھ سے کیا کرتا تھا کہ کیا کہوں۔ زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا تھا — کہنے لگا ''میں نے اس کے بعد سے تین اور آدمیوں کو بھی مارا اور مجھے ذرا بھی افسوس نہیں لیکن ہمارا ساتھی — اس کے لئے مجھے آج تک غم ہے — بہت اچھا دوست تھا سمجھدار، ملنسار، ہنس مکھ اور ایماندار —،، میں نے پوچھا ''تو پھر تم نے اسے کیوں مارا؟ کیا تمہیں یہ ڈر تھا کہ وہ تمہارا بھانڈا پھوڑ دے گا؟،، اور وہ مجرم میری اس بات پر بگڑ گیا — بولا: ''وہ، ہمارا دوست؟ ہرگز ہمارے ساتھ غداری نہیں کر سکتا تھا — کسی قیمت، کسی دولت پر نہیں — بس یہی تھا کہ یہ نہیں کیوں — کچھ ایسی بات تھی کہ اس کی موجودگی میں ذرا سکون نہیں ہوتا تھا — ہم سب گنہگار ہیں اور وہ بالکل ولیوں کی طرح پاک باز ہو — یہ تو کچھ ٹھیک نہیں لگتا تھا —،،

خرخول اٹھے اور کمرے میں ادھر ادھر چکر کاٹنے لگے — ہاتھ پیچھے باندھے، منہ میں پائپ دبائے، سفید تاتاری قمیص پہنے جو ایڑیوں تک پہنچتی تھی — فرش پر ان کے ننگے پاؤں دھپ دھپ کر رہے تھے — آہستہ آہستہ سوچ سوچ کر وہ بات کرتے جا رہے تھے:

''میں نے اچھے اور شریف انسانوں سے اس طرح لوگوں کو ڈرتے اکثر دیکھا ہے، بہترین لوگوں کا اسی سلسلے میں ختم ہو جانا بھی

دیکھا ہے — جب ایسے عمدہ لوگوں سے خواہ کو واسطہ پڑتا ہے تو دو باتوں میں سے ایک بات ہوتی ہے: یا تو وہ ان کو عاجز کر کے کسی نہ کسی طرح ختم کر دیتے ہیں یا پھر وہ کتوں کی طرح ان کی ہر نظر اور ہر لفظ کا پیچھا کرتے ہیں، ان کے سامنے بیٹھ کے ہی رینگتے ہیں ——— لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے — مگر جہاں تک اس کا سوال ہے کہ اس سے کچھ سیکھ سکیں یا اس کی طرزِ زندگی کو اپنائیں تو یہ بات ہی الگ ہے — خواہ کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ ایسا کیونکر کروں — یا جو ممکن ہے وہ کرنا چاہتے ہی نہ ہوں —”

انہوں نے اپنا چائے کا گلاس میز پر سے اٹھایا جو ٹھنڈا بھی ہو چکا تھا اور اپنی بات پھر جاری کر دی:

“یہ ہونا ناممکن ہے — آخر سوچو تو یہ بھی تو نتیجہ نکلتا ہے کہ لوگ محض [illegible] ڈر کے اپنے لئے کسی نہ کسی طرح کی ایک زندگی بناتے ہیں اور اس کے عادی ہو جاتے ہیں اور پھر کوئی یک و تنہا روح بغاوت کرتی ہے اور کہتی ہے کہ ان کی زندگی کا نظام ٹھیک نہیں — اچھا، ٹھیک نہیں! ہم نے تو اپنی زندگی کا تمام ست نچوڑ کر اسے بنایا اور تم کہتے ہو ٹھیک نہیں ——— لعنت ہے تم پر! اور وہ اس ولی پر، اس رہبر اور معلم پر ٹوٹ پڑتے ہیں ——— رہنے دو بھئی! بخشو ہمیں! لیکن حق تو بے شک ان ہی کے ساتھ ہے جو کہتے ہیں “تمہارا نظامِ حیات ٹھیک نہیں!” سچائی ان ہی کے ساتھ ہے اور اگر زندگی ترقی کے رستے پر گامزن ہے اور آگے بڑھ رہی ہے تو وہ ان ہی کی بدولت —”

کتابوں کی الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بولے:

“خصوص کر ان لوگوں کی کوششوں کی بدولت — کاش میں بھی کوئی کتاب لکھ سکتا! لیکن میرے خیالات بڑے بھدے اور گڑبڑ ہیں —”

وہ میز کے کنارے سے اٹھ گئے اور سر جھکا کے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور کہا:

''ایزوت پر کتنا رحم آتا ہے....''

بڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد بولے:

''اچھا خیر — اب تو میرا خیال ہے سونا چاہئے ہم لوگوں کو....''

میں اپنے کوٹھے والے حجرے میں چلا گیا اور کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا — آسمان پر کوندے کھیتوں اور میدانوں کے اوپر لپک رہے تھے — ہر بار جب ملتف سرخ روشنی تڑپتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ چاروں طرف سے اچھل کر مجھے لو ہٹ جاتا — کتے بھونک رہے تھے اور رو رہے تھے۔ اگر ان کے یہ بھونکنے سر آپس میں ملے ہوئے نہ سنائی دیتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے انسان کسی سنسان بیابان میں ہے — دور سے گھن گرج سنائی دے رہی تھی اور کھڑکیوں سے ایسا حبس اندر آ رہا تھا کہ دم گھٹا جاتا تھا —

ایزوت پھر میری نگاہوں میں پھرنے لگا — دریا کے ساحل پر پڑا ہوا، بید کی جھاڑیوں کے نیچے — اس کا نیلا چہرہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا لیکن پتھرائی ہوئی آنکھیں سختی سے خود اپنے اندر گھور رہی تھیں، سنہری داڑھی الجھی ہوئی تھی، منھ حیرت سے کھلا ہوا تھا —

''میکسیمچ، سب سے بڑی چیز ہے نیکی اور دوست داری — اسی لئے تو مجھے ایسٹر کا تہوار سب سے زیادہ پسند ہے کیونکہ وہ تہواروں میں سب سے زیادہ نیکی اور دوست داری کی تبلیغ کرتا ہے!''

اس کا نیلا پتلون شام کے ڈھلتے ہوئے سورج کی گرمی سے سوکھ گیا تھا اور اس کی نیلی انگلیوں سے لپٹا ہوا تھا جن کو دریا نے دھو دھا کر صاف کر دیا تھا — چہرے پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور جسم سے ایک بوجھل سی بو نکل رہی تھی جس سے متلی آتی تھی —

سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی، روماس آئے — اندر آتے ہوئے انہوں نے جھک کر دروازے کی چوکھٹ سے اپنا سر بچایا

اور پھر آکر میرے پلنگ پر بیٹھ گئے — ایک ہاتھ سے اپنی داڑھی پکڑی اور بولے:

''میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا تھا — میں شادی کر رہا ہوں....،،

''یہاں عورت کے لئے زندگی آسان نہ ہوگی....

انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا کہ اب اور میں کیا کہتا ہوں — لیکن میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں — کوندے کی لپک سے کمرے میں سرخ روشنی چمکی اور پھر مٹ گئی —

''میری شادی ماشا دیریکووا سے ہو رہی ہے....،،

مجھ سے مسکراہٹ رک نہ سکی — اس سے پہلے مجھے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ اس لڑکی کو کوئی ماشا کہہ سکتا ہے — اس کے باپ بھائی بھی نہیں کہتے تھے اور جہاں تک مجھے یاد ہے اور کوئی اس کو اس نام — ماشا — سے کبھی نہیں پکارتا تھا —

''تم کس بات پر ہنس رہے ہو؟،،

''کچھ نہیں —،،

''تمہارا خیال ہے اس کے لئے میری عمر زیادہ ہے؟،،

''نہیں تو، جی نہیں!،،

''اس نے مجھے بتایا کہ تم بھی اس سے محبت کرتے تھے —،،

''ہاں میرا خیال ہے کہ کرتا تو ضرور تھا —،،

''اور اب؟ ختم ہو گئی وہ محبت؟،،

''ہاں میرا خیال ہے کہ ختم ہو گئی ہے،،

انہوں نے اپنی داڑھی چھوڑ دی اور آہستہ سے بولے:

''تمہاری عمر میں انسان اکثر ایسی خوش‌فہمی میں مبتلا ہو جایا کرتا ہے — لیکن میرے سن میں یہ کوئی خواب‌وخیال نہیں ہوتا بلکہ دل اور روح پر اس بری طرح قبضہ کرتی ہے یہ چیز کہ اور کچھ سوجھتا ہی نہیں اور کسی بات کا خیال ہی نہیں آتا!،،

پھر ان کے چہرے پر ایک خشک مسکراہٹ آئی ۔ خوبصورت دانت دکھائی دینے لگے ۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے:

"انتونی نے جنگ ایکٹیم میں اوکتویانس سے اس لئے شکست کھائی کہ جب قلوپطرہ خوف کھاکر جہاز میں بھاگنے لگی تو وہ اپنے بیڑے کی کمان چھوڑ کر اور اپنے جہاز پر قلوپطرہ کے پیچھے پیچھے چل پڑا ۔ تو دیکھا تم نے کہ مرد کا کیا حشر کرتی ہے یہ چیز!"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے، کندھے پیچھے کو جھٹکے ۔

"بہرحال میں تو شادی کر رہا ہوں!" انہوں نے دوہرایا جیسے کوئی اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات کر رہا ہو ۔

"کب؟"

"خزاں کے موسم میں ۔ جب سیبوں کی فصل ختم ہو جائے گی ۔"

وہ باہر نکل گئے ۔ جاتے وقت انہوں نے چوکھٹ کے نیچے پھر سر جھکایا، اس بار ضرورت سے زیادہ نیچے جھک گئے ۔ بستر پر لیٹتے ہوئے میں نے سوچا کہ غالباً میرے لئے یہی بہتر ہوگا کہ جب خزاں آئے تو میں یہاں سے چلا جاؤں ۔ روماس نے انتونی کے متعلق وہ باتیں کیوں کہیں؟ مجھے اچھی نہیں لگیں ۔

جلد ہی شروع موسم کے سیبوں کے توڑے جانے کا زمانہ آنے والا تھا ۔ اس سال فصل خوب ہوئی تھی، ڈالیاں پھلوں سے لدی ہوئی، بوجھ کے مارے زمین چوم رہی تھیں ۔ پھلوں کے باغوں میں ہلکی مہک پھیلی ہوئی تھی، بچے جگہ جگہ باغوں میں گھومتے پھرتے تھے اور ہوا سے گرائے ہوئے یا کیڑے لگے ہوئے گلابی اور زرد پھل جمع کرتے پھرتے ۔

اگست کے اوائل میں روماس قازان گئے اور وہاں سے لوٹے ۔ اپنے ساتھ وہ ایک کشتی بھر کر سامان لائے ۔ دوسری کشتی میں بہت سی خالی ٹوکریاں بھری ہوئی تھیں ۔ ہفتے کا دن تھا ۔ صبح کے کوئی آٹھ بجے ہوں گے، خوخول منہ ہاتھ دھو کپڑے بدل کر ہنسے بیٹھے تھے اور خوش خوش باتیں کر رہے تھے:

"دریا پر رات کے وقت بڑا لطف رہتا ہے، بڑا ہی اچھا لگتا ہے...."

پھر یکایک سونگھتے ہوئے گھبرا کر بولے:

"کیوں؟ تمھیں جلنے کی بو نہیں آ رہی ہے؟..."

اسی وقت احاطے سے اکسینیا کے چیخنے کی آواز آنے لگی:

"آگ لگ گئی! ارے آگ لگ گئی!.."

ہم لوگ دوڑے ہوئے باہر پہونچے — پھلوں کے باغ کی طرف ہمارا جو سائبان تھا اس میں آگ لگی ہوئی تھی — اسی سائبان میں ہمارا مٹی کے تیل، کولتار اور دوسرے تیلوں وغیرہ کا گودام تھا — ایک پل تو ہم لوگ پاگلوں کی طرح کھڑے گھورتے رہے کہ آگ کی نارنجی زبان کس کاروباری انداز میں دیوار کو چاٹتی ہوئی چھت کی طرف بڑھ رہی تھی — تیز دھوپ میں اس کا پیلاپن مدھم پڑ گیا تھا — اکسینیا دوڑ کر ایک بالٹی پانی لائی — خوخول نے بالٹی بھر پانی آگ کی کھیلتی ہوئی کلیوں پر پھینکا — پھر بالٹی پھینک دی اور کہا:

"ارے اس کمبخت سے کچھ نہیں ہوگا — میکسیمچ آؤ، کنڈالوں کو باہر نکالا جائے! اکسینیا تم دوکان کی طرف دوڑ جاؤ!.."

میں نے تارکول کا ایک کنڈال تو سائبان کے باہر نکالا اور احاطے میں سے باہر گلی میں لڑھکا دیا — پھر میں مٹی کے تیل کے ایک کنڈال پر جھپٹا لیکن جو اس کو لڑھکانا شروع کیا تو پتہ چلا کہ ڈاٹ کہیں گئی ہے اور مٹی کا تیل فرش پر بہہ رہا ہے — جتنے میں ڈاٹ ڈھونڈوں آگ بھی بیکار نہیں بیٹھی — اس کی کریدتی ہوئی انگلیاں لکڑی کی دیوار کی دراروں میں سے نکل آئیں، چھت چٹخنے لگی اور میرے کانوں میں ایک بھیانک گنگناہٹ سنائی دینے لگی — آدھا خالی پیپا لئے میں باہر نکلا تو دیکھا بہت سے لوگ — عورتیں اور بچے — گاؤں بھر سے دوڑتے بھاگتے، چیختے چلاتے ہماری طرف آ رہے تھے — خوخول

اور اکٹھا دوکان کا سامان نکال نکال کر نالے میں ڈھیر لگا رہے ہیں۔ بیچوں بیچ گلی میں ایک بڑھیا سیاہ کپڑے پہنے مکے دکھا دکھا کر زور زور سے چیخے جا رہی تھی "ہائے، ہائے، ارے کمبختو! ارے شبختو!"

جب میں پھر سائبان میں لوٹا تو وہ گہرے گھنے دھوئیں سے اٹا اٹ بھر گیا تھا جس کے بیچ میں کوئی چیز چٹخ چٹخ کر جلتی ہوئی زوروں سے سلگ رہی تھی۔ چاروں طرف سرخ سرخ شعلے اچھل رہے تھے اور جلتے ہوئے چھت سے گر رہے تھے۔ لکڑی کی دیوار کا تو کچھ بچا ہی نہیں تھا، جل کر سرخ ہو گئی تھی۔ دھوئیں سے دم گھٹ رہا تھا، آنکھیں پھوٹی جا رہی تھیں۔ پھر بھی میں نے کوشش کر کے کسی طرح ایک کنڈال کو دروازے تک لڑھکا دیا لیکن وہاں پہنچ کر وہ دروازے میں اٹک گیا اور ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ چھت سے چنگاریاں برابر گر گر کر میرے چہرے اور بازوؤں میں چبھ رہی تھیں۔ میں نے مدد کے لیے آواز دی۔ خوخول دوڑے ہوئے آئے اور مجھے کھینچ کر احاطے میں نکال لیا۔

"بھاگو! ورنہ یہ پھٹنے ہی والا ہے..."

وہ تیر کی طرح مکان میں گھس گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گھسا اور دوڑ کر کوٹھے پر چڑھا تاکہ اپنی کتابوں کو بچانے کی کوئی صورت کر سکوں۔ جب میں ساری کتابیں کھڑکی سے باہر پھینک چکا تو میں نے دیکھا کہ ٹوپیوں سے بھری ہوئی ایک پیٹی بھی وہیں رکھی ہے۔ میں نے کوشش کی کہ اسے بھی اسی رستے پھینک دوں۔ لیکن کھڑکی چھوٹی نکلی۔ میں نے ایک دوسری باٹ اٹھائی اور کھڑکی کے چوکھٹے کو توڑنے لگا۔ اور پھر ایک دھماکہ ہوا، چھت پر کوئی چیز تیزی سے چمکی۔ مٹی کے تیل کا کنڈال پھٹ گیا تھا۔ چھت میں آگ لگ گئی تھی اور وہ جگہ جگہ سے چٹخ رہی تھی۔ شعلوں کا ایک سرخ چشمہ میرے کمرے میں جھانکتا ہوا میری

کھڑکی کے پاس سے گذر گیا۔ گرمی ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ میں دوڑا ہوا سیڑھی پر پہنچا لیکن وہاں دھوئیں کے گھونٹے بادل میرے استقبال کو موجود تھے اور سرخ سرخ ناگ سیڑھی پر چڑھتے رینگتے ہوئے آ رہے تھے۔ گیارے سے ایک چٹخنے کی آواز آرہی تھی جیسے لکڑی میں لوہے کے دانت دھنس گئے ہوں۔ میرے اوسان جاتے رہے۔ دھوئیں سے بالکل اندھا، سانس پھولی ہوئی، ہونقا ہوا میں چند سیکنڈ تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ وہ چند سیکنڈ تھے کہ زمانہ گذر گیا۔ شعلوں کا ایک سیلاب، سرخ داڑھی والا چہرہ جس کی تھوتھنی زرد تھی، کھڑکی کے پاس پل بھر کو نظر آیا، پھر غائب ہو گیا اور دوسرے لمحے چھت کو پھاڑ کر سرخ شعلے اس میں سے برسنے لگے۔

مجھے اس وقت ایسا محسوس ہوا کہ میرے بال جل رہے ہیں اور مجھے ان کے سلگنے کی چنچناہٹ سنائی دے رہی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی آواز مجھے سنائی نہ دی۔ میرے دماغ نے چیخ کر کہا کہ خاتمہ آ پہنچا۔ ٹانگوں میں جیسے سیسہ بھر گیا ہے۔ من من بھر کی ہو گئی تھیں۔ آنکھیں جل رہی تھیں اور جلن سے بے حد تکلیف ہو رہی تھی اگرچہ میں آنکھوں کو برابر ہاتھوں سے بچائے ہوئے تھا۔

اپنے آپ کو بچانے کا جو فطری جذبہ ہر انسان میں ہوتا ہے اس نے مجھے نکل بھاگنے کا واحد ذریعہ سجھا دیا۔ جتنی نرم چیزیں میرے ہاتھ آ سکیں وہ میں نے جلدی جلدی گود بھر کر سمیٹ لیں۔ اپنی پوشاک اور تکیہ اور بہت سی پیال لپیٹ لی، روماس کا بھیڑ کی کھال کا کوٹ سر اور کندھوں پر لپیٹا اور کھڑکی سے کود گیا۔

جب آنکھ کھلی تو میں نالے کے کنارے پڑا تھا اور روماس میرے پاس اکڑوں بیٹھے چیخ چیخ کر کہتے جا رہے تھے:

”کیوں؟ ٹھیک ہو نا؟،،

میں اٹھ کھڑا ہوا اور پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے کمرے، باڑے، کھنڈر ہوئے گھر کو تکنے لگا۔ اس پر تمام

سرخ سرخ چشمے سے ابل رہے تھے، کتے کی سی لال لال زبانیں سیاہ مٹی کو چاٹ رہی تھیں، کھڑکیوں میں سے کالا دھواں ہچکیاں لیتا نکل رہا تھا۔ چھت پر زرد زرد سرخ سرخ پھول لہرا لہرا کے رقص کر رہے تھے۔

روماس پھر ہنسے "کیوں، ٹھیک ہو نا..." ان کے دکھ سے تپے ہوئے چہرے پر ہنسنے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ اور اسے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے چکنے چکنے آنسو ان کے سیاہ چہرے پر رواں ہیں۔ آنکھیں پریشانی کی وجہ سے سرخی سے جھپک رہی تھیں، داڑھی میں پیال کے تنکے، بکھرے ہوئے الجھے ہوئے تھے۔ میرے وجود میں مسرت کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی۔ جذبات کا ایک شدید حملہ ہوا اور پھر بائیں ٹانگ میں سخت درد محسوس ہوا۔ اٹھتے بیٹھتے میں زمین پر گر پڑا اور ہونٹوں سے بولا:

"میری ٹانگ اکھڑ گئی ہے۔"

انہوں نے میری ٹانگ ٹٹولی اور پھر ایک دم سے اس کو زور کا جھٹکا دیا۔ ایک شدید درد میرے پورے جسم میں دوڑ گیا۔ اور پھر چند منٹ بعد میں ذرا ذرا لنگراتا ہوا مگر خوش خوش جو کچھ سامان بچا تھا اس کو اٹھا اٹھا کر حمام کی طرف لے جا رہا تھا۔ روماس بے حد خوش، پائپ دانتوں میں دبائے ہوئے:

"جب مٹی کا کنڈال پھٹا اور اڑتا ہوا کوٹھے کی چھت پر پہنچ گیا تو مجھے تو یقین ہو گیا تھا کہ اب ہم لٹ چکے ہیں، سب کچھ کھو بیٹھے ہم۔ آگ یکجا ہو کر بے حد اوپر اٹھ گئی تھی اور چھت پر جیسے ایک بڑی سی سانپ کی چھتری تن گئی تھی۔ سارے گھر میں آگ لگ گئی تو میں تو سمجھا کہ الوداع میکسیمچ۔"

وہ پھر معمول کی طرح پرسکون ہو گئے تھے اور بڑی باقاعدگی سے بچے ہوئے سامان کو اکٹھا کر رہے تھے۔ اکسینا بھی دھوئیں میں سیاہ، اجاڑ صورت، گھوم رہی تھی۔ اس سے بولے:

"تم یہاں سبھی رہو اور اس سامان کی حفاظت کرو۔ میں آگ کا مقابلہ کرنے جاتا ہوں۔"

ٹیلے پر پھیلے ہوئے دھوئیں میں کپڑوں کے ٹکڑے اڑتے ہوئے پھڑپھڑا رہے ہیں۔

"آگ،" روماس کہنے لگے "بد قسمتی تھی۔ بڑے افسوس کی بات ہے! میری کتنی عمدہ کتابیں تھیں...."

اس وقت سات چار اور جھونپڑوں میں بھی آگ لگ چکی تھی — ہوا تیز تھی، دن [illegible] شعلوں سے [illegible] وقت [illegible] رہی تھی۔ آگ برابر بڑھتی جاتی تھی اور آہستہ آہستہ دائیں بائیں پھیلتی جاتی تھی، جیسے اس کی نرم، نئی نوکیں پھنکیں اور ڈالیاں جھانک جھانک کر چھتوں اور احاطوں کی دیواروں اور جالیوں پر جھپٹ پڑنے رہی ہوں — جہاں جہاں سوکھے چھپر تھے ان کو سرخ سرخ کھرساں جیسے چھٹتی جاتی جا رہی تھیں، ہیں لہراتی ہوئی ان کی لپٹیں باڑوں پر سے چڑھتی اور اترتی تھیں — دھوئیں سے اٹی فضا میں شعلوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی — خوفناک، جیسے اس میں شکایت بھری ہو، غضب و کینہ بھرا ہو — اور جلتی ہوئی لکڑیوں کے چٹخنے کی مدھم تقریباً نرم آہٹ تھی — دھوئیں کے اڑتے ہوئے بادلوں میں سے سنہری ٹکڑے گلیوں اور احاطوں میں جابجا گر رہے تھے — لوگ بوکھلائے ہوئے دوڑ رہے تھے — ہر ایک کو اپنے گھر اور اپنے سامان کی پڑی تھی — اور چیختی ہوئی آوازیں بار بار ایک ہی صدا دہراتی سنائی دیتی تھیں:

"پانی! پا آآآ نی!"

لیکن پانی دور تھا، اونچے ساحل پر بسی ہوئی اس آبادی سے دور، والگا میں — روماس نے کسی کی آستین کھینچی، کسی کا گریبان پکڑا اور جلدی جلدی گاؤں والوں کو ایک جگہ اکٹھا کرکے دو حصوں میں تقسیم کیا — اور آگ والے حصے کے دونوں طرف دونوں گروہوں کو بھیجا کہ احاطوں کی باڑیں اور سائبان وغیرہ نوچ کر الگ

کر دیں — لوگوں نے بڑی مستعدی سے روماس کا حکم پورا کرنا شروع کر دیا اور اب ایک طرف آگ تھی جو بڑی خوداعتمادی کے ساتھ مکانات کی پوری قطار کو، پوری گلی کو جلا ڈالنا چاہتی تھی اور دوسری طرف لوگ سوجھ بوجھ سے جدوجہد کر رہے تھے —— اگرچہ ان کی جدوجہد میں یہ نظر آتا تھا کہ وہ سہمے ہوئے ہیں — وہ بہت ہی ناامیدی کے ساتھ آگ کا مقابلہ کر رہے تھے جیسے کسی عبث کا کام ہو —

میں بڑے جوش میں تھا اور ایسی طاقت محسوس کر رہا تھا جیسی زندگی میں کبھی نہیں کی تھی — میں نے یہ بھی دیکھا کہ گلی کے آخری سرے پر لوگوں کا ایک جتھا کھڑا تھا جس میں گاؤں کے کھاتے پیتے لوگ تھے — کورمین بھی تھا اور گاؤں کا مکھیا اس مجمع میں خاص طور پر نمایاں تھا — وہ لوگ اپنی جگہ پر کھڑے صرف شور مچا رہے تھے، اپنے ڈنڈے اور لکڑیاں گھما رہے تھے لیکن آگ بجھانے کے لئے انہوں نے چھچب تک نہیں ہلائی گویا یہ سب تماشہ تھا اور وہ صرف تماشائی — کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار کھیتوں کی طرف سے آ رہے تھے — ان کے گھوڑے اس تیزی سے دوڑ رہے تھے کہ سواروں کی کہنیاں اچھل اچھل کر ان کے کانوں سے جا لگتی تھیں، عورتیں رو پیٹ رہی تھیں، بچے ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے تھے —

اتنے میں پڑوس ہی کے احاطے میں ایک مکان کے باہری حصوں نے آگ پکڑ لی — ڈنے کا چھپر جو موٹی موٹی لکڑیوں اور بید کی جھاڑیوں کا بنا ہوا تھا، جلنے لگا — اس کی دیوار جلدازجلد گرائی گئی — اب بھی وہ چاروں طرف سے آگ کے سرخ سرخ فیتوں سے سجا ہوا تھا — کسانوں نے بلیوں پر کلہاڑیاں مارنی شروع کیں لیکن اوپر سے چنگاریاں اور جلتے ہوئے کوئلے ان پر گرے — وہ اچھل کر ایک طرف کو ہو گئے اور جہاں جہاں سے کپڑے جلنے لگے تھے وہاں مل مل کر بجھانے لگے —

خوخول زور سے چیخے ''ارے ڈرپوک نہ بنو! بزدل نہ بنو!''

جانی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر جوجوں نے کسی کے سر پر سے ہیٹ اتار لی اور میرے سر پر جما دی۔

"چلو تم اس طرف سے شروع کرو، میں ادھر سے شروع کرتا ہوں!"

میں نے ایک بلی کو کاٹا، پھر دوسری کو۔ دیوار ہلنے لگی۔ تب میں اس پر چڑھ گیا اور اوپر والے سرے کو ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر لٹک گیا۔ جوجوں نے میری لٹکی ہوئی ٹانگیں پکڑ کر زور سے کھینچیں اور آن کی آن میں پوری دیوار نیچے آ رہی۔ میں اس کے نیچے تقریباً دفن ہو گیا۔ لیکن سب سے میں کر جلدی سے جمی ہوئی دیوار کو کھینچتے ہوئے باہر بھی میں لے لئے۔

"بچ گئے؟" روماس نے پوچھا۔

ان کی اس مزاج پرسی سے مجھ میں نئی طاقت اور پھرتی عود کر آئی۔ یہ آدمی میرے لئے سب ہی کچھ تھا اور اس کے سامنے کارگذاری دکھانے اور سرخرو ہونے کا جذبہ اس وقت میرے اوپر شدت سے حاوی تھا اور اس کی خوشی کے لئے میں بڑے زوروشور سے کام کر رہا تھا۔ ہمارے سروں پر کتابوں کے ورق دھوئیں میں اڑتے ہوئے کبوتروں کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔

داہنی طرف ہم نے آگ روک دی تھی لیکن بائیں طرف شعلے بڑھتے ہی جاتے تھے۔ دس گھر اب تک آگ پکڑ چکے تھے۔ روماس نے چند آدمی داہنی طرف چھوڑے تاکہ وہ ان سرخ ناگوں کی کسی اور جانب کو کامیاب نہ ہونے دیں اور باقی کمک کو لے کر خطرے کے مقام پر پہونچ گئے۔ جب ہم لوگ دوڑتے ہوئے خوش حال کسانوں کے پاس سے گذرے تو میں نے سنا کہ ان میں سے ایک بڑے کمینے پن سے کہہ رہا تھا:

"یہ جان بوجھ کر آگ لگائی گئی ہے!"

اس پر کوزمین بولا "اس کا حمام دیکھو۔ وہ جگہ ہے تلاشی لینے کی!"

یہ الفاظ ناخوشگوار یاد بن کر میرے ذہن میں پیوست ہو گئے ۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ اشتیاق چاہے کسی قسم کا ہو —— اور خاص کر مسرت بھرا اشتیاق —— انسان کو بے پناہ قوت بخشتا ہے — میں اپنے جوش میں جٹا ہوا تھا اور تھکن کا احساس تک نہ ہو رہا تھا یہاں تک کہ میں بالکل ٹوٹ کر گر پڑا — مجھے یاد ہے کہ جب مجھے ہوش آیا تو میری پیٹھ کسی گرم چیز سے ٹکی ہوئی تھی اور روماس ایک بالٹی سے پانی لے لے کر میرے منہ پر چھینٹے مار رہے تھے — کسان ہمارے چاروں طرف کھڑے تھے اور تعریفیں کر رہے تھے:

"بچہ ہے بڑا زوردار!"

"یہ ساتھ چھوڑنے والی، دغا دینے والی اسامی نہیں ہے..."

میں نے اپنا سر روماس کی ٹانگوں پر ٹیک دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا — انہوں نے میرے گیلے بال پیار سے سہلائے اور بولے:

"اچھا، اچھا، اب آرام کرو! تم کافی بھگت چکے —"

کوکوشکن اور باریشوف دونوں شیطانوں کی طرح کالے بھجنگ ہو رہے تھے، مجھ کو لے کر دلاسا دیتے ہوئے نالے کی طرف چلے —

"کوئی بات نہیں بھائی، چلو، سب ختم ہوا —"

"ڈر گئے ابھی؟"

میں ابھی نالے کے کنارے لیٹا ہی ہوا تھا اور پوری طرح سنبھل بھی نہ پایا تھا جو میں نے دیکھا کہ تقریباً دس خوشحال کسان نالے کی طرف بڑھتے ہوئے، ہمارے حمام کی طرف جا رہے ہیں — آگے آگے مکھیا تھا، پیچھے پیچھے دو مددگار روماس کے دونوں بازو پکڑے چل رہے تھے — روماس کے سر پر ٹوپی نہیں تھی، گیلی قمیص کی ایک آستین نچ گئی تھی، تیوری پر بل تھے، چہرہ خوفناک ہو رہا تھا — سپاہی کوستن لکڑی گھماتا زور زور سے چیخ رہا تھا:

"پھینک دو اس کو آگ میں، بے دین، کافر!"

کسی نے کہا:

''حمام کھولو....''

روماس نے زور سے کہا ''تالا توڑ دو — کنجی کھو گئی ہے—''

میں جھٹ پٹ کھڑا ہو گیا۔ ایک ڈنڈا اٹھایا اور روماس کے پہلو میں جا کھڑا ہوا — اس پر روماس کے کئی لوگ چپکے سے کھسک گئے — مکھیف خوف سے دبی ہوئی آواز میں چیخ کر بولا:

''بھائیو، تالا توڑنا تمہارا کام نہیں، یہ قانون کے خلاف بات ہے!''

کوزمین نے میری طرف اشارہ کیا اور گرجا:

''یہ ایک اور ہے... آخر یہ ہوتا کون ہے؟''

روماس مجھ سے بولے ''مکسیمچ، ڈرو مت — ان لوگوں کا خیال ہے کہ میں نے سب سامان حمام میں چھپا دیا ہے اور پھر خود آگ لگا دی ہے—''

''یہ تم دونوں کا کام ہے!''

''توڑو تالا!''

''بھائیو....''

''ارے تو ہم جواب دیں گے قانون کو!''

''ہاں ہاں ہم قانون کو سمجھ لیں گے — توڑو تالا!''

روماس نے ہنس کے کہا:

''میری پیٹھ سے پیٹھ لگا کے کھڑے ہو جاؤ تاکہ یہ لوگ پیچھے سے نہ مار سکیں—''

لوگوں نے تالا توڑ دیا — کئی انسان ایک دم، ایک ساتھ حمام میں گھس گئے اور پھر فوراً ہی باہر نکل آئے — اس درمیان میں میں نے اپنی لکڑی روماس کو دے دی تھی اور خود ایک اور ڈنڈا سنبھال لیا تھا—

"حمام میں کچھ نہیں ہے....."

"نہیں، کچھ نہیں ہے!"

"جلاؤ، کچھ نہیں ہے!"

کسی نے ہچکچاتے ہوئے کہا:

"لوگو، بیکار ہی کیا یہ سب....."

لیکن کئی آوازوں نے جلوس میں شرابیوں کی طرح چیخ کر کہا:

"کیا مطلب؟ غدار لیڈر!"

"پھینک دو ان کو آگ میں"

"مفسد، منافق!"

"بڑے آئے یہاں نصیحت سنانے والے"

"ارے ڈاکو ہیں، ہمارے دشمن، گرو چوٹوں کا ہے!"

روسٹر کی آواز ان سب کے شور سے اوپر ابھری ہوئی سنائی دی

"چپ رہو! یہ لوگوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ نہیں کہ حمام میں کچھ نہیں ہے۔ پھر اب کیا چاہتے ہو؟ ہمارا سب کچھ جل چکا ہے۔ جو کچھ بچا ہے وہ یہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈھیر ہے۔ آخر مجھے اپنا سامان، اپنا گھر خود جلانے سے کیا لینا تھا"۔

"سمجھ گئے روبیہ"، کسی نے زور سے آواز دی

اور پھر دسیوں آوازیں زور زور سے چیخنے لگیں:

"اب انتظار کیا ہے؟"

"بس بہت ہو چکا!"

میرے گھٹنے کانپنے لگے اور پھر میری آنکھوں کے آگے بالکل اندھیرا چھا گیا۔ پھر سرخ سرخ شعلے اور دھوئیں سے سجتے وحشت زدہ چہرے نظر آنے لگے، چہروں میں سیاہ سیاہ بالوں بھرے چھید دکھائی دینے لگے جو جھپٹتے ہوئے دھاڑتے ہیں — میرے لئے طیش میں بھر کر آئی ہوئی بھیڑ اور سب کو ٹھونک کر رکھ دینے کے جذبے کو برداشت کرنا محال ہو گیا۔ وہ ہمارے چاروں طرف پھیلتے رہے ہیں اور اب ان کے لبوں پر ایک نئی چیخ تھی:

''اچھا تو ان کے پاس لاٹھیاں ہیں!''

''اچھا لاٹھیاں ہیں؟''

خوخول نے کہا ''یہ لوگ تو میری داڑھی نوچ ڈالیں گے'' اور مجھے ان کے لہجے سے اندازہ ہوا کہ وہ مسکرا رہے تھے ''تمھیں بھی حصہ ملے گا میکسیمچ — مجھے اسی بات کا غم ہے لیکن دیکھو گھبرانا نہیں، اوسان قائم رکھنا۔''

''دیکھو دیکھو، اس لونڈے کے پاس کلہاڑی بھی ہے!''

واقعی میری پیٹی میں ایک [illegible] والی کلہاڑی اٹکی ہوئی تھی جس کو میں خود تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔

روماس نے بڑے تحمل سے کہا ''ان لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں لیکن پھر بھی اگر یہ کچھ کریں تو بہتر یہی ہو کہ تم کلہاڑی نہ استعمال کرو۔''

ایک کسان جس کو میں نہیں جانتا تھا — لنگڑا، چیونٹی سا منحنی آدمی — عجیب طرح سے ناچتا ہوا چیں چیں کرتی ہوئی آواز میں زور زور سے چیخ رہا تھا:

''دور رہو، زد سے باہر رہ کر ان پر پتھراؤ کرو، مزا چکھا دو سالوں کو!''

اس نے اینٹ کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور زور سے پھینکا — وہ میرے پیٹ میں آکر زور سے لگا لیکن قبل اس کے کہ میں اس کا جواب دے سکوں کوکوشکن نالے کے اوپر سے تیر کی طرح دوڑتا ہوا اس کسان پر جھپٹا اور دونوں گتھم گتھا ہو کر لڑھکتے ہوئے نالے کے پیندے تک چلے گئے — پھر پانکوف نمودار ہوا — تیز تیز چلتا ہوا وہ ہماری طرف آ رہا تھا — اس کے ساتھ بارینوف اور لوہار بھی تھا اور دس بارہ کسان اور تھے — ایک دم کوزمین بڑے وقار کے ساتھ یہ کہتے ہوئے پسپا ہو گیا:

''میخائل، آپ واقعی صاحب عقل ہیں — آپ تو جانتے ہی

ہیں کہ آگ جو ہے سو وہ انسانوں کا دماغ پگلا دیتی ہے، دہقانوں کو مجنون بنا دیتی ہے —،،

روماس نے اپنی پائپ منھ میں سے نکالی اور جیب میں رکھتے ہوئے بولے ’’آؤ مکسیمچ، ہم لوگ شراب‌خانے میں چل کر جانے بیٹھیں —،، انہوں نے لاٹھی کا سہارا لیتے ہوئے نالے کی اوپر کی طرف تو بوجھل قدم اٹھانے شروع کر دئے اور جب کوزمین نے ان کے پہلو میں چلتے ہوئے کچھ اور کہنے کی کوشش کی تو ان کو دیکھے بغیر بولے:

’’دور ہو، گدھا کہیں کا!،،

ہم واپس ہوئے تو جہاں ہمارا گھر تھا وہاں دہکتے، چمکتے انگاروں کا نارنجی ڈھیر تھا۔ دہکتے کوئلوں کے درمیان باورچی خانے کا تنور ویسے کا ویسا ہی کھڑا تھا — اس کا کچھ بگڑا نہیں تھا بلکہ اب تک اس کی چمنی سے نیلا نیلا دھواں اٹھ اٹھ کر گرم ہوا میں شامل ہوتا جا رہا تھا۔ ایک لوہے کے پلنگ کی سرخ تپتی ہوئی پٹیاں ہر طرف کو نکلی ہوئی تھیں جیسے مکڑی کی ٹانگیں ہوں — جلے ہوئے پھاٹک کے ستون اس منظر پر پہرہ دیتے ہوئے، [illegible] ڈلے رنگ کے سپاہی معلوم ہوتے تھے جن میں سے ایک کے سر پر دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ ٹوپی تھی جس میں لہرائے ہوئے شعلوں کی سجاوٹ ٹوپی میں لگے ہوئے پروں کی مانند لگتی تھی —

’’کتابیں سب ختم ہو گئیں،، خوخول نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا — ’’ہائے افسوس!،،

بچے بڑے بڑے سلگتے ہوئے انگاروں کو گیند کی طرح احاطے سے لڑھکاتے ہوئے کیچڑ پڑی ہوئی گلی میں لیجا رہے تھے — وہاں پہنچ کر انگارے شائیں سے بجھ جاتے اور سفید کڑوا دھواں ان میں سے اٹھتا — بنی نوع انسان کا ایک چھوٹا سا نمونہ، کوئی پانچ سال کی عمر، الجھے بال، نیلی آنکھیں، گرم سیاہ کیچڑ کے ایک چہلے

میں بیٹھا ایک بڑی مڑی بالٹی کو ایک ڈنڈے سے زور زور سے پیٹ رہا تھا اور بجتے ہوئے دھن کی موسیقی میں مگن تھا ۔ آگ کے ڈرے ہوئے لوگ منھ لٹکائے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے اور جو کچھ گھر گرہستی کا سامان بچ گیا تھا اسے اکٹھا کر رہے تھے ۔ روتی ہوئی عورتیں کوستی، کاٹتی، جلے ہوئے سامان پر ایک دوسرے سے جھگڑ رہی تھیں ۔ باغوں میں پھولوں کے درخت خاموش کھڑے تھے ۔ یہاں وہاں کلیاں اور پھننگیں آگ کی لپٹ سے جھلس گئی تھیں اور سیبوں کی افراط اور بھی نمایاں ہو گئی ۔

ہم لوگ دریا پر گئے، نہائے، دھوئے اور پھر دریا کنارے والے شراب خانے میں چائے پینے جا بیٹھے ۔

''بہرحال جہاں تک سیبوں کا سوال ہے موٹی توند والے لڑائی ہار ہی گئے،، روماس نے کہا ۔

اتنے میں بانکوف اندر آیا ۔ وہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور ہمیشہ سے زیادہ مسکین نظر آ رہا تھا ۔

''کہو، کیا حال ہے؟ کیسا لگ رہا ہے؟،، روماس اس سے پوچھنے لگے ۔

اس نے کندھے ہلائے ۔ ''گھر کا تو ویسے بھٹہ تھا ہی ۔،،

پھر خاموشی چھا گئی، ہم لوگ اجنبیوں کی طرح بیٹھے ایک دوسرے کو تکتے رہے ۔

''میخائل، اب کیا ارادہ ہے؟،،

''سوچ رہا ہوں ۔،،

''تم کو یہاں سے جانا ہی پڑے گا ۔،،

''دیکھا جائے گا ۔،،

''میں نے ایک پلان سوچا ہے،، بانکوف نے کہا ۔ چلو چلیں باہر، بات کریں...،،

دونوں باہر چلے گئے ۔ دروازے سے جاتے ہوئے بانکوف نے

رک کر اور مجھے مڑ کر مجھ پر نظر ڈالی اور کہا "تم میاں بڑے بزدل نہیں ہو — تم یہاں رہ سکتے ہو، ہم سے تو سب ہی ڈریں گے ،،

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں دریا کے کنارے پر جھاڑیوں کے سائے میں لیٹ کر پانی کو دیکھنے لگا۔ سورج ڈوب رہا ہے لیکن ابھی گرمی باقی ہے — اس گاؤں میں میں نے اب تک جو دن گذارے ہیں وہ اس طرح آنکھوں میں پھر رہے ہیں جیسے دریا کی سطح پر ان کی رنگین روغنی تصویریں بنی ہوں۔ دل پر ایک نامعلوم سا بوجھ تھا۔ لیکن تھکن نے فوراً اپنا عمل کیا اور میں گہری نیند سو گیا۔

یکایک مجھے نیند میں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی مجھے دور سے آواز دے رہا ہے — پھر ایسا لگا جیسے کوئی مجھے جھنجھوڑ رہا ہے اور کھینچ کر گھسیٹتا ہوا کہیں لے جانے کی کوشش کر رہا ہے: "ارے کیا مر گئے ہو؟ اٹھو نا،،

دریا کے پرے وادیوں پر چاند نکلا ہوا تھا — اس وقت وہ بیل گاڑی کے پہیئے کے برابر معلوم ہو رہا تھا اور خون کی طرح سرخ تھا — بارتنوف میرے پاس گھٹنے ٹیکے، میرا کندھا جھنجھوڑ رہا تھا —

"ارے اٹھو، آؤ نا — خوخول ہم کو کب سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہو رہے ہیں!،،

پھر ڈھلوان پر میرے ساتھ ساتھ چڑھتے ہوئے وہ بڑبڑانے لگا:

"یہ تو تمہاری کوئی بات نہ ہوئی کہ جہاں جی چاہا ہٹ کے لمبے ہو رہے — فرض کرو کوئی اوپر چڑھتا چڑھتا پھسل جائے اور تم پر کوئی پتھر ہی لڑھک پڑے یا کوئی جان بوجھ کر ہی لڑھکا دے تو!؟ یہاں لوگ کسی کام کو ادھورا نہیں چھوڑتے، پورا ہی کرکے رہتے ہیں — یہاں ہماری طرف کے لوگ، بہت تو دل میں برائی رکھتے ہیں، بعض رکھتے ہیں کیونکہ اس سے بہتر چیز ان کے پاس اور ہے بھی کیا جو اپنے دل میں رکھیں —،،

جھاڑیوں کے پاس سے کسی کے سر سر چلنے کی سرسراہٹ سنائی دی، پھر جھاڑیاں ہلنے لگیں اور پھر میکوں کی زوردار، پاٹ دار آواز سنائی دی ''ہلو؟''

پارسنوف نے اندھیرے سے چلا کے جواب دیا ''میں گشت لگا رہا ہوں —''

کچھ دور تک ہم لوگ خاموش چلتے رہے۔ پھر پارسنوف نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا ''پھر چوری چوری مچھلیاں پکڑنے جا رہا ہے یہ میکوں — اس کی بھی زندگی کیا مشکل کی زندگی ہے ....''

جب میں اندر پہنچا تو واسن نے مجھے خوب ڈانٹ پلائی:

''ایسی بے پروائی کرتے ہو — کیا مار کھانے کا ارادہ ہے؟''

پھر جب پارسنوف چلا گیا تو منہ بنا کے مجھ سے آہستہ آہستہ کہنے لگے:

''میکوف ٹھیک ہے۔ نہ وہ تمہیں اپنے یہاں رکھے گا کیونکہ وہ ایک دو دن میں چھوڑنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ لیکن میں تمہیں مشورہ نہیں دوں گا کہ تم اس پیسکس کی مدد کرو — جہاں تک میرا سوال ہے میں نے جو کچھ کہا ہے وہ میکوف نے ہی ساتھ بیچ دیا ہے اور اب وعدہ کر رہا ہوں کہ جیسے ہی وہاں میرا ٹھکانہ ہو جائے گا تمہیں بلا لوں گا — تم وہاں آ کر میرے پاس رہنا۔ ٹھیک؟''

''سوچوں گا —''

''اچھی بات ہے —''

وہ فرش پر لیٹتے ہی سو گئے، ایک دو بار کروٹ لی اور چپ چاپ پڑ رہے — میں کھڑکی کے پاس بیٹھا والگا کو تکتا رہا — پانی میں چاند کا عکس ایسا لگتا تھا جیسے کسی کی آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی ہے۔ ایک اسٹیمر دور کے کنارے پر سے گزرا، اس کے پہیوں کی بھاری چھپا چھپ سنائی دی۔ مستولوں والی سرخ لالٹینیں اندھیرے میں ڈول رہی تھیں جیسے ستاروں پر سے گزر رہی ہوں — کبھی کبھی لالٹینیں ستاروں کو چھپا بھی دیتی تھیں —

رومینس نے رنج بھری آواز میں کہا "کیوں؟ انسانوں کے متعلق سوچ سوچ کر جی جلا رہے ہو؟ نہ کرو ایسا ... بے وقوف ہیں یہ سب، بس یہی بات ہے — اور مفلسی اور کینہ بھی اسی حماقت کا ایک پہلو ہے —"

لیکن مجھے ان الفاظ سے تسکین ہو سکتی تھی، نہ الفاظ میری تشفی کر سکتے تھے، میرے زخم دل کا علاج نہیں ہو سکتے تھے — میری نظروں میں پھر وہی روئیں دار، بدنما چہرے گھومنے لگے اور ان کی وہ کینہ پرور چیں چیں کرتی ہوئی چیخیں جیسے پھر سے میرے کانوں میں سنائی دینے لگیں:

"دور رہو، رد سے باہر رہ کر ان پر پتھراؤ کرو۔"

اس وقت مجھ میں اتنا شعور نہ تھا کہ اپنی یادداشت سے وہ چیزیں کس طرح کر پھینک سکوں جن کا بھول جانا ہی بہتر تھا — یہ سچ ہے کہ ان لوگوں کو فرداً فرداً دیکھا جائے تو ان میں سے ہر ایک میں بغض اور کمینہ پن بہت تھوڑا سا ہی ملتا — بعض میں تو قطعی نہیں — بنیادی طور پر سبھی اچھی طبیعت کے جنگلی جانور تھے — ان میں سے ہر ایک کو بچوں کی طرح ہنسایا جا سکتا تھا اور ان میں سے ہر ایک بچوں کی طرح کہانیاں سن کر خوش ہوتا تھا — کہانیاں جن میں تلاش عقل و مسرت کی داستانیں ہوتی تھیں، فراخ دلی اور شرافت کے کاموں کا بیان ہوتا تھا — ان لوگوں کے عجیب دلوں کو ہر وہ بات عزیز ہوتی ہے جو ایک ایسی آسان زندگی کے خواب دکھائے کہ جس میں ہر شخص کا قانون اس کی اپنی مرضی ہو —

لیکن جب بھی لوگ اکٹھے ہو جاتے تھے تو ایک اژدھام بن جاتے تھے — گاؤں کی بیٹھکوں میں ہو یا ساحل والے شراب خانے میں تو وہ اپنی تمام اچھی خصوصیتیں بالائے طاق رکھ دیتے تھے اور پادریوں کی طرح جھوٹ اور دکھاوے کی سجاوٹ اختیار کر لیتے تھے — گاؤں

کے اسراروں کے سامنے انسان کی بے بسی [illegible] میں [illegible] خود بھی تو [illegible] ایسے وقت میں ان کو کوئی دیکھتا تو ان سے بات [illegible] نہ [illegible] سکتا۔ یا پھر ان پر غصے کے ایک دورے سے پڑتے ــ بھیڑیوں کی طرح ان کے بال کھڑے ہو جاتے، دانت باہر نکل آتے اور ایک دوسرے پر بھیڑیوں کی ہی طرح غراتے ہوئے وہ لڑنے لگتے [illegible] رہے لیکن ذرا ذرا سی بات پر [illegible] ایسے موقعوں پر وہ نہایت خوفناک ہوتے اور ان سے کوئی بعید نہ ہوتا کہ اس [illegible] بجا لانے کی [illegible] جس میں [illegible] وہ [illegible] سکتی [illegible] اور دستبرداری سے [illegible] ہوتے ہیں جس طرح بھیڑیں [illegible] میں اپنی [illegible] ان لوگوں میں [illegible] قسم کے [illegible] کرتی ہے لیکن ان کے حصے میں [illegible] محبت نہیں آئی [illegible] ان سے بے پروائی برتے ہیں اور ان سے نفرت تک کرتے ہیں

میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا [illegible] تھا اور جس دن وہاں رخصت ہوئے اس دن میں نے ان سے اپنے یہ تلخ خیالات بیان کئے۔

”یہ سمجھ میں [illegible]“ انہوں نے ملامت کرتے ہوئے کہا۔

”خیر ـــ لیکن اگر مجھے اس کا یقین ہے تو میں کیا کروں“

”یہ بالکل غلط منطق ہے، غلط نتیجہ ہے ــ بالکل بے بنیاد ــ“

نہایت شفقت اور صبر کے ساتھ وہ مجھے بڑی دیر تک یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ میں غلطی پر تھا اور جو نتائج میں نے نکالے تھے وہ بھی غلط ہیں۔

”دوسروں کو مجرم ٹھہرانے میں جلد بازی سے کام نہ لینا چاہئے ـــ مجرم ٹھہرا دینا تو سب سے آسان طریقہ ہے ــ اس طریقے کو اندھا دھند طور پر اختیار نہ کرنا چاہئے ــ معاملات پر زیادہ

جدائی پہ غم نہ کرو، نہ ہر بات کو دل پر رکھا کرو اور یاد رکھو نہ ہر بات گزر جاتی ہے اور ہر چیز بہتر ہوتی جاتی ہے — آہستہ آہستہ، بے شک آہستہ آہستہ لیکن مسلسل طور پر! ہر چیز کا خود مطالعہ کرنے کی کوشش کرو، ہر چیز کو اپنے ہاتھوں کے لمس سے محسوس کرنے کی کوشش کرو، ڈرو کسی چیز سے نہیں لیکن میرا معجزہ کسی کو نہ بتاؤ۔ اچھا سنہرے دوست الوداع — ہم پھر ملیں گے — "

پندرہ سال بعد سیدلتس میں ہم پھر ملے — اس دوران روماس نے نارودنویے وولیا کے مقدمے میں قید کرنے کی سزا میں یاکوتسک کے علاقے میں جلاوطنی کے دس سال اور کاٹے تھے

جب روماس کراسنوویدوو سے چلے گئے تو مجھ پر سخت مایوسی اور بےچارگی چھا گئی — اپنا وجود سیسے کی طرح بھاری محسوس کرنے لگا۔ میں گاؤں میں ایک پلے کی طرح مارا مارا پھرتا تھا جو اپنے مالک سے بچھڑ گیا ہو۔ بارینوف کے ساتھ میں گاؤں کے پاس خوشحال کسانوں کی زمینوں پر کھیت مزدور کا کام کرنے لگا۔ اناج کاٹنا، آلو کھودنا اور بیلوں کے تھانوں کی صفائی کرنا — میں بارینوف کے حمام میں رہتا تھا —

ایک رات جب بارش ہو رہی تھی، بارینوف نے کہا "الکسئی، تو اب بہت اکیلے ہو گئے ہو۔ دیکھو ہم لوگ سمندر پر کل ہی روانہ ہو جائیں تو کیسا رہے؟ آخر اب یہاں ہمارا رہنا ہی کیا ہے۔ یہاں کے لوگ ہم لوگوں کو پسند نہیں کرتے اور کون جانے کس دن یہ لوگ کیا کر بیٹھیں، شراب کے نشے میں کیا کر گزریں — "

بارینوف نے یہ تجویز پہلے بھی پیش کی تھی — اس پر خود بھی بہت اداسی چھائی ہوئی تھی — اس کے بازو جو بندر کی طرح لمبے لمبے تھے، دونوں طرف بےجان سے لٹکے ہوئے تھے اور وہ چاروں

طرف اس غرور سے تکتی مایوسی سے [illegible] تھا جیسے وہ کسی جنگل میں راستہ بھول گیا ہے —

بارش کی بوچھار سے [illegible] رہی تھی [illegible] نے اپنے گھوڑے نے جو ناکے کی طرف منہ نکالا ہوا تھا [illegible] کو پیچھے سے بھو لپھلا کرنا شروع کر دیا تھا [illegible] طوفان کی [illegible] گھوڑوں کی [illegible] میں [illegible] نے آہستہ سے پھر پوچھا:

"تو پھر ہم لوگ روانہ ہو جائیں [illegible]"

اور ہم لوگ روانہ ہو گئے —

... [illegible] کی [illegible] کے [illegible] کی طرف [illegible] — کس [illegible] کہ [illegible] میں [illegible] حصے [illegible] کے [illegible] چلانے والے [illegible] تھا، بھاری [illegible] آدمی تھا [illegible] بھاری بھاری قدم اٹھاتا اور [illegible] کر دیے [illegible]:

"او — ووپ! او — رر — ووو!"

[illegible] کی طرح [illegible] کی طرح [illegible] چلا جا رہا تھا اور آہستہ آہستہ [illegible] کے پہلوؤں میں [illegible] لگتا تھا — [illegible] کے [illegible] کے [illegible] لٹکے ہوئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ [illegible] میں [illegible] رفتار تاریکی کے [illegible] اور کچھ نہیں — [illegible] کو [illegible] ہوئے تھی، دنیا ساری [illegible] کھل کر اس اندھیرے میں مل گئی تھی، شعلوں اور پانی [illegible] تھی اور پھر یکجان ہو کر بہتی ہوئی کسی خاموش خلا کے نشیب میں دوڑتی چلی جا رہی تھی جہاں نہ آفتاب تھا، نہ ماہتاب، نہ ستارے

[illegible] اندھیرے میں چھپا ہوا سامنے کی طرف [illegible] چل رہا تھا اور ہانپ رہا تھا [illegible] ہوں ہوں، بیچ بیچ [illegible] ہوئی، جیسے وہ

دھارے کی اس بوٹ سے زورآزمائی کر رہی ہو جو اسے نیچے کی طرف گھسیٹ کر لے جانا چاہتی ہو۔ تین روشنیاں —— دو پانی کی بالکل سطح کے اوپر اور ایک کافی اونچائی پر —— اسٹیمر کو راستہ دکھا رہی ہیں۔ قریب کی چند روشنیاں سنہری مچھلیوں کی طرح لگتی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بادلوں کے بالکل نیچے ہی لٹکی ہوئی ہیں ان میں سے ایک شعلے بھرے کے مستول پر کے سرے والی لالٹین تھی۔

مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کسی سرد اور چکنے حباب کے اندر گرفتار کر دیا گیا ہوں، وہ ایک نشیب پر پھسلتا چلا جا رہا ہے اور میں اس کے ساتھ پھنس رہا ہوں مکھی کی طرح اس کے اندر پھنسا ہوا۔ جیسے وہ بتدریج حرکت رفتہ رفتہ رکتی جا رہی ہے اور وہ لمحہ بالکل قریب ہے جب قطعی رک جائے گی، اپنی گڑگڑاہٹ بند کر دے گا اور جیسے پانی میں پہیئے چلنے سے رک جائیں گے، تمام آوازیں یوں ختم ہو جائیں گی جیسے درخت سے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ یوں مٹ جائیں گی جیسے سلیٹ پر سے چاک کا لکھا مٹا دیا جاتا ہے اور میں خاموشی اور سکوت کی اجنبی آغوش میں جا پڑوں گا؟

اور وہ بھاری بھرکم آدمی جو پتوار کا دستہ تھامے کھڑا ہے، بھاری سا بھیڑ کی کھال کا کوٹ پہنے، پتھر جیسا بت بنا ہوا، وہ بھی رک جائے گا اور اس افسوں کے اثر سے ہمیشہ کے لئے بے حس و حرکت کھڑا ہو جائے گا۔ پھر وہ نہیں غرائے گا:

''اوررروپ! اوورر...''

میں نے اس سے پوچھا:

''تمہارا نام کیا ہے؟''

اس نے بے دلی سے جواب دیا ''تم کو اس سے مطلب''

یہ آدمی ریچھ کی طرح بھدا تھا۔ پچھلی شام جب ہم قازان سے روانہ ہو رہے تھے تو ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں میں نے

اس کا چہرہ غور سے دیکھا تھا — اور وہ چہرہ ایک اندھے کی آنکھوں کا سودہ سا نظر آتا تھا جس پر آنسو رک گئے تھے۔ پتوار کے پاس کھڑے ہوئے اس نے واڈکا کی ایک بوتل ایک لکڑی کے پیالے میں انڈیل لی تھی، اس کو ہنسی کی طرح غٹاغٹ پی گیا تھا اور اوپر سے ایک سیب کھا لیا تھا — اور جب بجرا گھڑگھڑا کے چل پڑا تو اس آدمی نے دستے کو خوب مضبوط پکڑ لیا تھا، گردن اٹھا کر سورج کے سرخ گولے کو دیکھا تھا اور سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دے کر سختی سے کہا:

”مدد پروردگار کی!“

اسٹیمر چار بجروں کو لے کر نژنی نووگوروڈ کے میلے سے استراخان کی طرف جا رہا تھا — ان میں ایک ہمارا بجرا بھی تھا۔ اس پر جو مال تھا — لوہے کی چادریں، شکر کے بورے، لکھے بھاری بھاری پیٹیاں — یہ سب سامان ایران جا رہا تھا — ماکسیموف نے پیٹیوں کو ٹھوکر سے ٹھیک ٹھیک کیا، پھر سونگھا، ذرا دیر سوچا اور کہا:

”یقیناً ہموئیں ہیں، امرتسک کے کارخانے سے جا رہی ہوں گی....“

لیکن ماکسیموف کی پسلیوں میں پتوار چلانے والے نے ایک مکا دیا اور پوچھا:

”پھر تمھیں اس سے کیا مطلب؟“

”نہیں، میں ویسے ہی سوچ میں پڑ گیا تھا ذرا....“

”کیا کھوپڑی تڑوانا چاہتے ہو؟“

ہم لوگوں کے پاس چونکہ مسافروں والے اسٹیمر کا کرایہ نہیں تھا اس لئے ہم لوگ اس مال والے بجرے پر ”ازراہ مہربانی“ بٹھا لئے گئے تھے — اور اگرچہ ہم لوگ ملاحوں کی طرح کھڑے پہرہ دے رہے تھے لیکن پھر بھی بجرے پر کے سبھی لوگوں کی نظروں میں ہماری حیثیت بھکاریوں کی سی تھی

”اور تم عوام کی بات کرتے ہو....“ ماکسیموف نے کہا — ”زندگی کو سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اگر آپ اوپر جانا چاہتے ہیں تو

[illegible] دوسروں پر سواری کرتے ہیں اور اگر نہیں [illegible] تو دوسرے آپ پر سواری کرتے ہیں —— اور بس —"

رات کا اندھیرا اس قدر گہرا تھا کہ مجھے دوسرے جہاز نظر نہیں آ رہے تھے، صرف ان کے مستولوں کی نوک دکھائی دے رہی تھی [illegible] کی سی روشنی، گھنے دھوئیں کے سے بادلوں میں [illegible] بادلوں میں [illegible] کی بو آ رہی تھی

سوار چلانے والے کا اس طرح منھ لٹکائے خاموش رہنا مجھے برا لگ رہا تھا۔ جہاز کے بڑے ملاح نے مجھ سے کہا تھا کہ سوار کے ذہن کے [illegible] جانور [illegible] رہوں اور اس جانور کی مدد کروں۔ جب اندر کی روشنائی کچھ مدھم سی ہوتی معلوم ہوتی تو وہ آہستہ سے کہتا:

"اے سنبھال! سنبھال!"

میں الجھن [illegible] سنبھالنے میں مدد دوں

پھر وہ بڑبڑاتا "ہو گیا، ہو گیا —"

اور میں پھر عرشے پر بیٹھ جاتا — بات کرنے کی ہر کوشش بے کار ہوتی تھی کیونکہ وہ ہر بات کا جواب ایک سوال کی شکل میں دیتا تھا:

"پھر تمہیں اس سے کیا؟"

آخر وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں الجھن کیوں تھا؟ جس وقت ہم اس جگہ سے گزرے جہاں سے [illegible] والنکا کے نیچے سے [illegible] ہے، تو اس نے اپنا منھ ساحل کی طرف کیا اور بڑبڑایا:

"گندے —"

"کون؟"

کوئی جواب نہیں —

دور کہیں، رات کے اندھیرے میں کتے بھونک رہے تھے، رو رہے تھے [illegible] ایک ایسی [illegible] جو [illegible] دلاتی تھی کہ زندگی

ابھی سانس لے رہی ہے اور زندگی کے معاملے میں [illegible] رہتی ہے، وہ [illegible] نہیں ہوتی تھی۔ اسے [illegible] دور لگتی تھیں جیسے یہ لوگ ان تک پہنچ [illegible] کو ان تک پہنچنے کی ضرورت نہیں۔

ہوا چلانے والے نے [illegible] اعلان [illegible] کے جتنے کتے ہیں —— سب بے کار —"

"[illegible] کے لوگوں سے [illegible] ہے —— [illegible] کے .."

"ہر جگہ کے [illegible] ایسے میں جہاں [illegible] رہنے [illegible] خون والے نے ہیں اصلی کتے...."

"اور وہ جگہ کہاں ہے؟"

"وولکدا —"

اور اب الفاظ اس طرح اٹھنے [illegible] جیسے [illegible] جیسے [illegible] بھڑکنے ہی جیسے [illegible] ہیں [illegible] کے [illegible] الفاظ:

"یہ تمہارے [illegible] لوگ ہے [illegible] جیسی [illegible] جہاں تک خیال ہے وہ [illegible] ہے — [illegible] ہے —— وہ [illegible] ہوشیار [illegible] بھی ہے اور [illegible] بھی —— ایک [illegible] ٹھکانہ دار ہے، [illegible] میں اور ایک [illegible] بھی ہے اس کے پاس —"

وہ الفاظ [illegible] اس طرح آہستہ آہستہ ادا [illegible] جیسے [illegible] بے ہوشی [illegible] کے بول رہا ہو — پھر خاموش ہو کر سامنے کی طرف گھورنے لگا — نگاہیں [illegible] کر اسٹیمر کے [illegible] کی [illegible] پر جمی تھیں جو اندھیرے کے جالے میں چمکدار مکڑی کی طرح لگی تھی [illegible] مجھے اس کی آنکھیں نظر نہیں آ رہی تھیں —

"سنبھالو، سنبھالو... اچھا تو [illegible] پڑھ سکتے ہو، تو [illegible] یہ معلوم ہے کہ یہ قانون کی باتیں [illegible] لوگ [illegible] ہے؟"

جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے اپنی بات جاری رکھی:

''لوگ صحیح صحیح کی بات لکھتے ہیں۔ بعض لکھتے ہیں کہ سب قانون زار لکھتا ہے اور بعض لکھتے ہیں کہ بڑے پادری بناتے ہیں — کاش مجھے یہ ٹھیک سے پتہ چل جائے کہ کون بناتا ہے تو میں جا کر اس سے ملوں اور کہوں کہ قانون ایسا بناؤ کہ میں مرنا تو خیر دور رہا عاقبت بھی نہ پا سکوں۔۔ قانون کو ہلا اور کنجی کی طرح آنکھیں موند جانے ——— میرے دل پر ہاتھ ڈال دو اور بس کرو — پھر میں جواب دے لوں گا لیکن اس طرح تو میں جواب دہ نہیں ہو سکتا عادل نہیں ہو سکتے ۔۔''

اب وہ خود ہی خود بڑبڑا رہا تھا اور اس کی آواز مدھم ہوتی چلی جا رہی تھی، باتوں میں ربط ختم ہوتا جاتا تھا، تلوار کے دستے کو مکوں سے دھما دھم کوٹ رہا تھا —

اسٹیمر کی طرف سے کوئی ملاقوں میں کچھ چیخا اور وہ بے جان انسانی آواز کتوں کے رونے اور بھونکنے کی طرح بالکل بے موقع اور بے معنی لگتی تھی جیسے رات بے تکی لگتا — اسٹیمر کی پھول روشنیاں دم بجھتے ہوئے پانی کی سیاہ تاریکی کو چیرنے میں ناکامیاب ہو کر ختم ہوتی، ڈوب گئیں اور اوپر سے لیٹز کی ذریت کی طرح، بھاری اور لیس دار، سیاہ اور بھونڈے بھونڈے بادل اڑے چلے جا رہے تھے — ہم پہنچتے جا رہے تھے، جدھر تاریکی، اور زیادہ تاریکی کی حکومت تھی

یہ شخص چڑچڑا اور بڑبڑا رہا تھا:

''یہ آخر ان لوگوں نے میرا کیا حال کرنے کی سوچی ہے! میرا تو دل بالکل ہی بیٹھ جا رہا ہے......''

مجھ پر بے زاری کا عالم طاری ہو گیا اور ایک سرد بے جان سی مایوسی چھا گئی — اب مجھے نیند کے سوا کسی چیز کی طلب نہ تھی —

بادلوں کے درمیان سے زرد نکلا۔ جدوجہد کرتا ہوا، پھیکا زرد ——— صبح اور وہ بھی آفتابی نور کے بغیر کس قدر بے حال

دھواں نکل رہا تھا۔ صبح جس نے [illegible] سے [illegible] سرمئی رنگ بن گیا تھا — [illegible] کے مرنے کے نعرے رہ رہ کر [illegible] جھڑ رہے، [illegible] سانچوں والے [illegible] کے رنگ لگے لوٹے کے ٹکڑے سے واضح ہو رہے تھے [illegible] ڈوں کے [illegible] اور ایک [illegible] کا [illegible] جیسے [illegible] میں سے [illegible] ہوا لگے کا تھا [illegible] ایک مرغا [illegible] ہوئی دم سے نکل گئی [illegible] پانی کی [illegible] سی سجی ہوئی

ہمارا سفر ختم ہوا [illegible] نے ساحل کے نیچے جا لگا [illegible] — لیکن بہت دیر [illegible] مجھے [illegible] لگا — [illegible] میں دھکوں اور جھڑکی [illegible] کی [illegible] نے مجھے [illegible] سے ہیبت ناک [illegible] دیکھ رہا ہوں [illegible] ملاح نظر آئے جو پتوار چلانے والے [illegible] کی دیوار پر کھڑے ہوئے تھے اور چلے جا رہے تھے —

"جانے دو [illegible]"

"خدا محفوظ رکھے [illegible] پھر بھی جانے کی [illegible]"

"تم کچھ خیال نہ کرو — جانے دو"

اور وہ دونوں ہاتھ سینے پر جیسے [illegible] تھا، اس زور سے کہ [illegible] دونوں کندھوں میں دھنسی جا رہی تھیں [illegible] ایک کونے سے [illegible] گرتے پر [illegible] کا [illegible] تھا — وہ ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر رہا تھا، بس باری باری سے [illegible] ملاح کی طرف دیکھتا اور منہ سے کہتا:

"مجھے جانے دو، مجھے [illegible] سے دور جانے دو"

اس کے [illegible] بھی [illegible] اور [illegible] بھی، صرف قمیض اور پتلون پہنے تھا — [illegible] ہوئے [illegible] جیسے [illegible] کا ڈھیر بکھرا ہوا تھا۔ [illegible] کی سی [illegible] آنکھیں اس ڈھیر کے پیچھے سے [illegible] بیزاری کا [illegible] ہوئی [illegible] کر رہی تھیں

’’ارے تم ڈوب جاؤ گے،، ملاح لوگ کہہ رہے تھے ۔

’’میں؟ کبھی نہیں ڈوبوں گا ۔ مجھے چھوڑ دو بھائیو! نہیں تو اگر میں نہ گیا تو میرے ہاتھ سے اس کا خون ہو جائے گا ۔ جیسے ہی ہم سمبرسک پہنچیں گے ویسے ہی میں....،،

’’ارے اب جانے بھی دو ۔ چھوڑو بھی ۔ ،،

’’آہ بھائیو، تم کیا جانو....،،

اس نے گھٹنے ٹیک دئے اور اپنے ہاتھوں کو اتنا پھیلایا کہ وہ دونوں طرف کیبن سے جا لگے ۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے مصلوب کیا گیا ہو، اور پھر منت کرنے لگا:

’’مجھے جانے دو، مجھے بچنے دو گناہ سے!،،

اس کی آواز بڑی ہی عجیب طرح سی کھری اور پھنسی ہوئی لگ رہی تھی اور اس میں دلدوز التجا تھی ۔ پھیلے ہوئے بازو چھوؤں کی مانند نظر آ رہے تھے اور ہاتھ جن کی ہتھیلیاں سامنے کو تھیں کانپ رہے تھے ۔ اس کا ریچھ جیسا چہرہ بھی گھنی داڑھی میں لرز رہا تھا ۔ چھوٹے کی سی سرخ آنکھیں، ننھی ننھی، لال لال، باہر کو نکلی ہوئی تھیں ۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ہاتھ جو دکھائی نہیں دے رہا تھا، اس کا گلا دبا کے گھونٹ رہا ہے ۔

خاموشی کے ساتھ وہ تینوں آدمی اس کے رستے سے ہٹ گئے ۔ وہ گڑبڑا کے اٹھا، اپنا بنڈل سنبھالا اور کہا:

’’شکریہ!،،

عرشے کو پار کر کے وہ اس پھرتی اور صفائی سے عرشے کی منڈیر پر سے کودا کہ ایسی پھرتی کی مجھے تو اس سے امید نہ تھی ۔ میں بھی بھاگ کر عرشے کی منڈیر پر پہنچا اور اتنا دیکھ لیا کہ بیوتر نے اپنا بھیگا ہوا سر جھٹکا، اس پر بنڈل جمایا اور آڑا تیرتا ہوا ریتیلے کنارے کی طرف بڑھا ۔ کنارے کی جھاڑیوں نے ہوا کے جھونکوں

سے جھک جھک کر اس کا استقبال کیا اور پانی میں زرد پتوں کی اشرفیاں گرا کر اس پر نچھاور کیں ۔

وہ ملاح کہنے لگے :

''تو آخرکار اس نے اپنے اوپر قابو پا ہی لیا !،،

''کیا کچھ پاگل ہے ؟،، میں نے پوچھا ۔

''نہیں وہ پاگل نہیں ہے ـــــ وہ تو اپنی روح کو گناہ سے بچا رہا ہے ....،،

اب پیوتر چھچھلے پانی میں پہنچ گیا تھا ۔ وہاں پہنچ کر وہ کمر کمر پانی میں ایک منٹ کے لئے کھڑا ہو گیا اور ادھر مڑ کر زور سے اپنا بنڈل سر کے اوپر گھمایا ۔ ادھر سے ملاحوں نے بھی زور سے آواز دی :

''الوداع !،،

کسی نے پوچھا :

''پاسپورٹ کے بغیر یہ کیا کرے گا؟،،

سرخ بالوں، ٹیڑھی ٹانگوں والے ایک ملاح نے بڑے مزے میں مجھ کو پورا قصہ سمجھایا :

''سمبرسک میں اس کا ایک چچا ہے، اس نے اسے دھوکہ دے کر جو کچھ بھی اس کے پاس تھا وہ سب چھین لیا ۔ چنانچہ اس نے ارادہ کیا تھا کہ اس کو مار ڈالے گا ۔ مگر خیریت گذری کہ اس نے اپنے آپ پر قابو کرکے اپنے کو گناہ سے بچا لیا ۔ ویسے آدمی تو وحشی ہے مگر نرم دل ہے ! نیک انسان ہے ....،،

اتنی دیر میں وہ نیک انسان چڑھائی کی طرف ریتلی پگڈنڈی پر بڑھتا جا رہا تھا اور وہ جلد ہی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا ۔

یہ ملاح لوگ بڑے اچھے لوگ نکلے ۔ سب کے سب ہی میری طرح والگا کے رہنے والے تھے اور شام ہوتے ہوتے میں ان میں خوب گھل مل گیا ۔ لیکن دوسرے دن میں نے دیکھا کہ مجھ

rekhta

پر مشکوک سی برہم نظریں پڑ رہی ہیں اور میں نے اندازہ لگایا کہ بارینوف کی زبان کھل گئی ہوگی اور اس نے ان ملاحوں کو نہ جانے کیا داستان گھڑ کر سنا دی ہوگی۔

''کیا تم نے گپ بازی شروع کر دی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے سر کھجایا اور گھبرا کر قبول دیا:

''ہاں، تھوڑی سی۔'' اس کی نسوانی آنکھوں میں مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

''میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ زبان بند رکھنا؟''

''ہاں ہاں وہ تو میں نے بند رکھی مگر بات یہ ہے کہ وہ کہانی اتنی اچھی تیار ہو گئی تھی۔ ہوا یوں کہ ہم لوگ تاش کھیلنا چاہ رہے تھے اور گڈی تاش کی غائب ہو گئی کیونکہ وہ اس کے پاس تھی ۔۔۔ تو ہم لوگوں پر اکتاہٹ چھا گئی! پھر میں بات کرنے لگ گیا۔۔۔''

چند سوالات کرنے پر یہ کھلا کہ بارینوف نے محض وقت کاٹنے کے واسطے ایک نہائت ہی پیچیدہ قسم کی داستان کا تانا بانا تیار کیا۔ اور اس داستان کے آخر میں خوخول اور یہ خاکسار دیہاتی لوگوں کے ایک پورے مجمع کے مقابلے میں کاہاڑیوں سے جنگ کرتے ہوئے دکھائے گئے ۔۔۔ پرانے سورماؤں کی طرح۔

اب اس پر ناراض ہونا تو بیکار ہی تھا۔ اس کے لئے تو سچائی صرف وہی تھی جو حقیقت کی حد سے باہر ہو۔ ایک دن جب ہم لوگ کام کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے اور ایک نالے کے کنارے پر سستانے بیٹھ گئے تھے تو اس نے بڑے یقین کے ساتھ، نہائت نرمی سے مجھ سے کہا تھا:

''سچائی؟ انسان کو چاہئے کہ اپنے لئے سچائی خود تلاش کرے، اپنی سچائی خود ڈھونڈے جس سے اس کا دل مطمئن ہو۔

rekhta

دیکھو وہ نالے کے پار بھیڑوں کا ایک گلہ چر رہا ہے نا، ایک کتا بھی ہے اور ایک چرواہا بھی – اچھا تو پھر اس سے کیا؟ بھلا اس بات سے ہمارے اور تمہارے دلوں کو کیا گرمی اور کیا جوش نصیب ہو سکتا ہے؟ عزیزم، تم تو چیزوں کو ویسی ہی دیکھنے کی کوشش کرو جیسی کہ وہ ہیں: لوگ برے ہیں، یہ تو ہوئی سچائی، اور اچھے لوگ کہاں ہیں؟ بات یہ ہے کہ اچھے لوگوں کو ایجاد کرنا پڑتا ہے، ان کو گھڑنا پڑتا ہے – سمجھے؟‘‘

جب ہم لوگ سمبرسک پہنچے تو ملاحوں نے بڑی بری طرح سے ہم لوگوں سے وہاں اتر جانے کو کہا – ’’تمہارے ایسے لوگ ہمیں درکار نہیں ہیں‘‘ انہوں نے اعلان کیا –

کشتی میں بٹھا کر وہ ہم لوگوں کو کودی تک پہنچا آئے – کچھ دیر تو ہم لوگ کنارے پر بیٹھے کپڑے سکھاتے رہے پھر دیکھا تو دونوں کے ملا کر تقریباً سینتیس کوپک ہمارے پاس تھے – پھر ایک شراب‌خانے میں گئے، چائے پی –

’’اب کیا کیا جائے؟‘‘ میں نے پوچھا –

’’یہ کیوں پوچھتے ہو؟‘‘ بارینوف نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا – ’’بس چلتے رہیں گے –‘‘

ہم لوگ سمارا تک ایک پسنجر اسٹیمر میں چھپ کر گئے، سمارا میں ایک بجرے میں ملازمت کرلی جو تقریباً سات دن میں بغیر کسی گڑبڑ کے ہمیں کسپین سمندر کے کنارے لے آیا – وہاں ہم مچھیروں کی چھوٹی سی ارتیل میں شامل ہو گئے – یہ ارتیل کبانکل بائی کی گندی کالمک ماہی‌گہ پر قائم تھی –

rekhta